

369/ROP

Acc. No.
508

ارمغان ایران و ہند

(فارسی کا شعری سفر)

مصنف

ڈاکٹر زبیب حیدر

ریڈر شعبہ فارسی

ویمنس کالج - عثمانیہ یونیورسٹی

(C) جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب

ارمغان ایران و ہند

مصنف

ڈاکٹر زبیر حیدر

ریڈر شعبہ فارسی

ویمنس کالج، جامعہ عثمانیہ

گھر کاسٹہ 5/134 - 3-22

کوئٹہ داراب جنگ، یاقوت پورہ، حیدر آباد - ۲۳

فون نمبر 4417313

پانچ سو

تعداد کتاب

۱۹۹۶ء

سن اشاعت

۸۰ (اسی) روپے

قیمت

سید علی نظامی، نئی سڑک، چنچل گوڑہ حیدر آباد

کمپیوٹر کمپوزنگ

ہندوستان آرٹ پرنٹرس، بالسی کھیت،

طباعت

نور خاں بازار، حیدر آباد

یہ کتاب کی اشاعت میں اردو اکیڈمی کی جزوی اعانت شامل ہے

انتساب

میرے والد بزرگوار

نواب سید محمد حیدر خاں

کے نام

جو میرے پہلے استاد رہے ہیں جن سے میں نے الفبا سیکھا اور جنہوں نے۔

مجھ میں شعر و ادب کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی۔

صفحہ نمبر

- ۱- سخن کوتاہ، ڈاکٹر ابوالقاسم رادفر ۴
- ۲- تعارف، پدماشری ڈاکٹر شریف النساء انصاری ۷
- ۳- مقدمہ، ڈاکٹر نذیب حیدر ۱۱
- ۴- شاہ نامہ فردوسی کی تاریخی و تمدنی اہمیت ۱۵
- ۵- عمر خیام ۲۲
- ۶- سعدی شیرازی ۳۴
- ۷- غزل مولانا روم ۴۸
- ۸- خسرو و حسن بحیثیت شاعر ۵۴
- ۹- تغزل حسن سجزی ۶۷
- ۱۰- حافظ و شعر حافظ ۸۰
- ۱۱- فارسی غزل میں عرفی کی شاعرانہ عظمت و انفرادیت ۸۷
- ۱۲- بیدل ۹۵
- ۱۳- غالب کا فکر و فن کلیات غالب کی روشنی میں ۱۰۲
- ۱۴- پروین اعتصامی ۱۱۳
- ۱۵- ادبیات انقلاب اسلامی کی چند جھلکیاں، ترجمہ ڈاکٹر ابوالقاسم رادفر ۱۲۳

کوتاه سخن

زندگینامه نویسی و بیان حالات بزرگان فرهنگ و ادب در هر کشور و هر زبانی همواره از گذشته تا کنون وجود داشته و دارد. بومژه در سرزمین های شرق و ریشه دار فرهنگی چون ایران و هند امروز زندگینامه نویسی یکی از انواع ادبی در شمار داستان نویسی، نمایشنامه نویسی، مقاله نگاری طنز نویسی بحساب می آید. حتی افرادی در جهان شهرتشان به نوشتن بیوگرافی و شرح احوال است و فور شخصیت های برجسته در زبان ادب و فارسی همواره از قدیمترین ایام سیره نگاران و تذکره نویسان را واداشته است که در طول حیات زبان فارسی دست به نوشتن کتاب های تحت عنوان تذکره، تاریخ شعراء و نویسندگان برزند که لزوم تکرار مطالبی در باره تذکره نویسی را درین گفتار کوتاه نمی بینم در سالهای اخیر که برخورد فرهنگ و ادب شرق و غرب پیش آمد و تأثیر و تأثر ادب فرهنگ به صور گوناگون بروز کرده است. شیوه تذکره نویسی و سیره نگاری گذشته هم دوچار تغییر و دگرگونی شده است و معیارهای نقد ادبی و هنری و انواع دیگر نقد را بخود گرفته و به ایجاد دیگر زندگی افراد هم در تهیه زندگینامه توجه شده است. ازین رو زندگینامه نویسی امروزه به عنوان یک نوع ادبی پویا و دلچسپ در محافل ادبی و هنری مطرح است البته این منوط به رعایت اصول علمی و هنری و شناخت روصیه خوانندگان و مهارت در پرداختن صاحب زندگینامه دارد. به عبارت دیگر این امر بسیار کار دقیق و ظریف است و همگان را یارای نوشتن زندگینامه مطلوب و دلپسند همگان نیست.

شاید بتوان گفت رایج ترین نوع زندگینامه، شرح احوال شاعران است زیرا که تذکره های بزرگ شعری در مقایسه، دیگر تذکره ها به اندازه ای است که، امروزه کتابهایی در تاریخ تذکره های فارسی دارد و برخی زبان های دیگر داریم در حالیکه "موضوعات دیگر کمتر به

وجود چنین کتاب های برمی خوریم -

همانطور که شرایط زندگی و مسائل مردم در جنبه های گوناگون نسبت به گذشت بسیار
تغیر کرده به دلیل عدم فرصت کافی در امور ادبی و هنری هم بیشتر تمایل افراد به آگاهی یافتن از
زندگی نامه بزرگان و مشاهیر و انتخاب بهترین اشعار شاعران و آثار هنرمندان در رشته های
دیگر است -

ازین رو است که در عصر کنون ما به مجموعه آثاری برمی خوریم که حالات، آثار، سبک
و نمونه اشعار تعدادی شاعر را در بردارد، اینگونه آثار اگر باروش علم و دقیق همراه با معیارهای
هنری فراهم گردد خود می تواند خدمتی شایسته در ارتقای ادب باشد - بویژه اشخاصی که کارنامه
حیات آمان میراث و سرمایه فرهنگی و ادبی کشور های متمدن و دارای قدمت تاریخی چون ایران و
هند باشد -

کتابی که پیش رو دارید در واقع هدف گردآورنده آن چنین بوده است که بدان اشاره
شده اما اینکه تاچه حد درین کار کامیاب شده قضاوت آن به عهده خوانندگان، و خیره و با انصاف
است - سرکار خانم دکتر زینب حیدر این بار دست به کار تازه ای زده اند زیرا زمین های تحقیق
ایشان بیشتر بررسی اسناد و تاریخ انشاء نویسی و تهیه مقالات تاریخی، مذهبی بود و در این رشته ها
کارهای خوبی چه در زمینه تالیف و چه ترجمه و تصحیح انجام داده اند که ذکر جزئیات آن در این گفتار
کوتاه امکان پذیر نیست -

مؤلف محترم در این کتاب زندگی و آثار و سبک و نمونه آثار تعدادی از شاعران نامور
و سرشناس ایران و هند را که در عرصه زبان و ادب فارسی جایگاه ویژه ای دارند گردآورده و مجموعه
ای به زبان اردو برای علاقه مندان فراهم آورده اند امید است که این کوشش موجب شود تا

افراد بیشتری به ادب فارسی روی آورند و میراث هزار ساله ادب فارسی را پاس دارند۔۔ امید
است که خداوند متعال به ایشان توفیق عنایت فرماید تا در آینده شاهد آثار دیگر ایشان باشیم۔

ابو القاسم رادفر

عضو حیات علمی پژوهشگاه علوم انسانی

حیدرآباد۔ دوم نومبر ۱۹۹۶ء

استاد مہمان دانشکاه عثمانیہ

بخش فارسی

تعارف

اوراق تاریخ اس امر کے شاہد ہیں کہ فارسی زبان ہندوستان کی سرزمین پھٹاؤ پر تقریباً ہزار سال تک زبان رسمی کی حیثیت سے اپنا سکھ جمائے ہوئے رہی۔ ادبیات فارسی کا دامن شعر و نثر، تاریخ و تصوف، فلسفہ و طب، ہیئت و نجوم کے گران بھاجو اہر مندوں سے اس قدر مملو ہے کہ اس کی ارزش و اہمیت کا انکار کسی صاحب نظر ناقد و محقق کے لئے ناممکن ہی نہیں دشوار بھی ہے۔ جہاں اسانڈہ سخن کے دوادین و نثری شہکار اس بات کے گواہ ہیں وہیں تواریخ عہد شاہان مغلیہ ہند و سلاطین و کن اپنے بے بہا خرمین سے اس زبان کی عظمت کا اعتراف کر رہے ہیں اور ان ادوار کے سیاسی، سملجی، ثقافتی اور ادبی کارناموں کے امین بھی ہیں۔

زیر نظر مجموعہ مقالہ جات "ارمغان ایران و ہند" فاضل مقالہ نگار کی اس مسامی کا عصارہ ہے جس کے ذریعہ موصوفہ نے بحرور کو شش کی ہے کہ متقدمین سے معاصرین تک جتنے مشاہیر شعراء ان کی جلب توجہ کا باعث ہوئے ان فن پاروں کا اپنی مقدور بھرا حاطہ کریں

ڈاکٹر زینب حیدر نے سب سے پہلے "شاہنامہ فردوسی" کو معرض بحث میں لایا ہے۔ جس کے متعلق خود فردوسی طوسی نے اپنی عرق ریزی کا اس شعر میں اظہار کیا ہے

بسی رنج بردم بدین سال سی

نجم زندہ کردم بہ این پارسی

"شاہنامہ" ایران کا وہ قابل قدر انسائیکلو پیڈیا محسوب ہوتا ہے جو قبل اسلام سے لے کر عہد غزنوی تک کے سیاسی، تمدنی، اجتماعی و ادبی نقیب و فرائز کا آئینہ دار ہے۔ اور اس دور کا معتبر ماخذ بھی۔ جسے ادبیات فارسی کے عناصر اربعہ کا ایک اہم ستون بھی شمار کیا جاتا ہے۔

امام المتعز لین سعدی شیرازی کے منظوم و منشور تخلیقات کو مورد نظر قرار دیکر ان پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو موصوفہ کے صاحب نظر ہونے کی علامت ہے۔ سعدی پر قلم تو

بہت سی ہستیوں نے اٹھایا ہے مگر یہ مضمون فاضل مقالہ نگار کی ارادت مندی کا مظہر ہے۔
 مقالہ ”حافظ و شعر حافظ“ میں پہلے اس عہد کے معاشرے پر مرتب ہونے والے معائن
 و محائب کو کلام حافظ پر اثر انداز ہونے کا ذکر ہے اور پھر ان تاثرات کو شعر حافظ میں تلاش
 کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حافظ کی جذبات نگاری بے ثباتی کائنات، اخلاقی اقدار، فلسفیانہ
 خیالات، دوستوں سے تعلق، دشمنوں سے مداوا، عشق و عرفان کی مستیوں سے سرشار اشعار
 کو لطیف انداز میں نذر قارئین کیا گیا ہے۔

عمر خیام نیشاپوری کی حیات و کلام پر بسوط مقالہ سپرد قلم ہے۔ خیام کی حیات سے
 متعلق تفصیلات متعدد تذکروں سے دستیاب ہوتے ہیں مگر کلام کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر
 کرنا اہم مسئلہ ہوتا ہے اور یہ فرض مصنف نے بطرز احسن نبھانے کی کوشش کی ہے۔ مضمون
 کے بین السطور خیام کی فکر کی روشنی میں تخلیق کائنات کے پوشیدہ رموز کی تلاش کے موضوع
 کا ذکر ہے۔ حق تو یہ ہے کہ فخر جیرالڈ، محقق جرمنی نے خیام کے افکار کو رمد مشربی پر محمول کیا
 ہے۔ صوفیاء اس کو عرفان کا جامہ پہناتے ہیں۔ فلسفی اس کے اشعار میں فلسفیانہ تخیل کو
 صوفشان پاتے ہیں بہر حال فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

مولانا روم اپنی شنوی کے سبب شہر آفاق ہیں۔ جس کو ”ہست قرآن در زبان پهلوی“
 کہا جاتا ہے۔ مگر در حقیقت مولانا کا عشق ایک نادر شان تغزل کا حامل ہے ”دیوان شمس تبریز“
 اس کا بین ثبوت ہے جو دراصل مولانا روم کا کلام ہے جو ان کے پیرو مرشد کے نام سے متعارف
 ہے۔ یہاں مولانا کی غزلیات کو موضوع بحث قرار دیا گیا ہے اور اس میں عشق کی سرگرمی، ہجر کا
 اضطراب جو کلام مولانا میں جاری و ساری ہے اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایران سے ہجرت کر کے ہندوستان آنے والے بے شمار شعرا میں ایک نام عرفی شیرازی
 کا ہے جو عہد جہانگیری میں وارد ہندوستان ہوا یہ جوان سال شاعر جوانی ہی میں داعی اجل کو
 لبیک کہہ گیا۔ اس کے سرمایہ سخن میں غزل کو نمایاں مقام حاصل تھا قصیدہ تو وہ کسب معاش
 کے لئے نظم کرتا تھا چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

قصیدہ کار ہوس لپیٹگان بود عرفی

تو از قبیلہ عشقی وظیفہ ات غزل است

عرفی سبک ہندی کا نمائندہ شاعر رہا ہے لہذا مضمون آفرینی۔ معاملہ بندی محاسن شعری، ندرت خیال سے اس کا کلام مملو ہے اور اس امر کی شہادت اس مضمون میں پائی جاتی ہے۔

ایرانی شعراء کی صف آخر میں پروین اعتصامی کا تذکرہ شامل ہے جو عصر پہلوی کی ایک نامور خاتون شاعرہ تھی اور جو ادبیات محاصر میں مردوں کے شانہ بہ شانہ جہاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس نے معاشرہ کی کمزوریوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ کارگر اور مزدور کی طبقاتی کشمکش کو منظر عام پر لانے کی جسارت کی ہے۔ عورت کو اس کے مقدس و عظیم مرتبہ پر فائز کرنے کی کوشش کی۔ تصویر زن کو کائنات کے چوکھٹے میں پیش کرنا اپنا فرض سمجھا ہے۔ اور اس کو اس کے صحیح مقام پر فائز کرنے کا حق ادا کیا ہے۔

”ارمغان ایران و ہند“ کا دوسرا پہلو ان احل قلم شعرا پر مبنی ہے۔ جو ہندوستان میں معرض وجود میں آئے۔ جن میں سرفہرست خسرو اور ان کے ہم عصر حسن سجری ہیں۔ ہر دو شعراء کا عہد ایک تھا اور ممدوحین بھی ایک ہی۔ حسن سجری کے کلام میں سوز و گداز، تاثر، جاذبیت بدرجہ اتم تھی مگر وہ خسرو کی طرح پرگو نہیں تھے۔ لہذا زبان زد خاص و عام نہ ہوسکے مگر عرفان و تصوف ان کے اشعار کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ خسرو تو ہندوستان کے ذوللسانین شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور وہ معاملہ بندی کے موجد تھے ان کے اشعار ہر محفل سماع میں گائے جاتے ہیں اور عرفا و ارادت مندوں کے زخمِ بھراں کا موثر مرہم ثابت ہوتے ہیں اس مضمون میں اس خصوصیت کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

مرزا بیدل، سبک ہندی کے سہل ممتنع اشعار کے سر تاج مانے جاتے ہیں اور ان کی پیروی کا غالب نے پدباکانہ اعتراف کیا ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

بیدل کے کلام میں تمثیل، مبالغہ آرائی۔ محاسن صوری معنوی کا استعمال ہر قدم پر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اشعار کے عمق میں غوطہ زنی کر کے درحالیٰ شہوار حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر زبید حیدر نے "غالب کے فکر و فن" پر اظہارِ نظر کر کے اپنی حس لطیف کا مظاہرہ کیا ہے۔ غالب ہمیشہ اپنے فارسی کلام پر نازاں رہے اور اردو اشعار کو "مجموعہ بی رنگ" سے تعبیر کرتے رہے۔ غالب نے عرفی، خاقانی و بیدل جیسے دقت پسند شعراء کی پیروی کی ہے۔ انہوں نے عام راہ سے ہٹ کر اپنے لئے ایک نئی شاہراہ بنالی تھی اور اس پر پوری شان و عزم کے ساتھ گامزن رہے۔ اور "سرخیل غزل گویان ہند کہلائے"

ڈاکٹر زبید حیدر فارسی ادب کے دامن و وسیع میں اور مزید اضافہ کی خواہاں ہیں انہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے قبل ازیں دو کتب (۱) ترجمہ توارخ آصف جاہی (۲) تاریخ دکن کے چند گوشے۔ زیور طبع سے آراستہ کر کے حدیثِ قارئین کئے ہیں ان کی یہ مساعی قابلِ افتخار بھی ہے اور درخورِ اعتنا اضافہ بھی۔

ڈاکٹر شریف النساء انصاری

سابق پروفیسر و صدر شعبہ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی

مقدمہ

ایران و ہند تعلقات بہت ہی قدیم اور مستحکم ہیں۔ فارسی زبان کا اثر ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر بہت پڑا۔ ہمارے معاشرے میں ایرانی تہذیب رچ بس گئی ہے۔ فارسی زبان ہمارے لئے کوئی غیر زبان نہیں ہے بلکہ یہ زبان کوئی آٹھ سو سال تک ہمارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی رہی ہے اور ہمارے ملک کی انتظامی زبان رہی ہے۔ ہمارے تمام اسناد جو مغلیہ، بہمنی، عادل شاہی، عماد شاہی، برید شاہی، قطب شاہی اور آصف جاہی دور کے ہیں یہ سب فارسی زبان ہی میں ہیں۔ اور ہماری تہذیب پر ایران کے تمدن اور ثقافت کا گہرا اثر ہے ہمیں آج بھی فارسی زبان و ادب کے پڑھنے سے ایران کی تہذیب و تمدن اور وہاں کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ہماری اردو شاعری نے بڑی حد تک فارسی زبان کا اثر قبول کیا۔ خصوصاً غالب میر، سودا، ذوق، میر حسن، دیا شکر نسیم، انیس، دبیر، تلیق وغیرہ کی غزلوں کی شنیوہوں اور مرثیوں پر ہمیں فارسی زبان کا گہرا اثر نظر آتا ہے اور ایرانی تہذیب و تمدن کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اسی لئے ہمیں فارسی زبان و ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ یہاں پر میں نے چند فارسی شعراء کا کلام اور ان کے حالات پیش کئے ہیں اور فردوسی پر دین اعتصامی تک فارسی کے شعری سفر میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں انہیں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن میں خسرو و حسن جیسے شاعر ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ان کی شاعری ہمیں پھلی پھولی۔ شروع میں ایرانی خسرو کو شاعر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن اب انہوں نے خسرو کی شاعری کا اعتراف کر لیا ہے اور ایران میں خسرو دوست اہل قلم ان کے کلام پر تحقیق کر رہے ہیں اور خسرو پر ایران میں ایک عالمی کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی جس میں تمام دنیا سے دانشمند تشریف لائے تھے۔ جو خسرو شناسی کی دلیل ہے۔

خسرو کے ہمعصر ہی حسن ہیں جن کی شاعری پر بھی ایران کی تہذیب و تمدن کا اثر ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں ہندوستانی عوامل بھی نظر آتے ہیں۔ میں نے اس کتاب میں خسرو و حسن کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فردوسی کے شاہ نامہ کی تاریخی تہذیبی اور تمدنی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے ہمیں خود اپنی شناخت میں مدد ملتی ہے۔ فردوسی نے کہا ہے۔

عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اور فردوسی کے بعد خیام و حافظ جیسے شعراء کے کلام سے روشناس کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیام کا کلام فارسی شاعری کی جان ہے اور خیام کی رباعیات ہی کی وجہ سے اس کا نام زندہ ہے اس کے کلام کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ خیام نے زندگی کے مختلف مسائل کو اپنی رباعیوں میں پیش کیا ہے وہ عیش امروز کو فکر فردا پر ترجیح دیتا ہے اور Epiquirin تھیوری Eat, drink be Merry کا معتقد ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کو دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہے وہ زندگی کے معمہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تمام مفکروں اور فلسفیوں کی طرح وہ بھی معلوم شد کہ بیچ معلوم نہ شد کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔

حافظ کا کلام زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ غم محبوب کو وہ دل سے لگائے رہتا ہے لیکن وہ صرف حال ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور جو کچھ بھی حال میں میر ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتا ہے۔ ”غم فردا“ اور فکر ”دی روز“ کو فضول سمجھتا ہے۔ شوپن ہاور نے کہا ہے۔

”مختصر زندگی، مختصر جوانی اور مختصر ترین خوشی کی وہ

گھڑیاں جو انسان کو خوش قسمتی سے ہاتھ آتی ہیں۔“

اسی نئے حافظ کا خیال ہے جو بھی کرنا ہے وہ آج ہی کر ڈالنا چاہیے۔ کل کس نے دیکھا ہے۔ حافظ زندگی کے اس معمہ کا حل ڈھونڈ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ ملاوں کی پردہ دری کرتا ہے۔ اخلاق کی تعلیم ”بادوستان مطلق بادشمنان مدار“ کہہ کر کرتا ہے اور کبھی قسمت پر قائل ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

کشتی نشستگانیم اے باد شرط بر خیز

باشد کہ باز بینم آں یار آشارا

حافظ کا کلام فارسی شاعری کو باقی رکھنے کے لئے کافی ہے جو کوئی اس کو پڑھتا ہے اس سے لطف اندوز ہونے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غالب و بیدل کے کلام پر بھی میں نے روشنی ڈالنے کی کوشش کی یہ دونوں شاعر ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں ہیں لیکن ایران میں ان کی شناخت نہیں تھی ایرانی ان کو شاعر ماننے پر تیار نہیں تھے لیکن آج کل غالب اور بیدل کی شاعری کی پہچان ایران میں ہو رہی ہے۔ بیدل کو ایک صوفی اور فلسفی شاعر سمجھ کر اس کے کلام کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اور اس کے کلام سے اور حالات زندگی سے متعلق محقق تحقیق کر رہے ہیں مقالہ لکھ رہے ہیں۔

عرفی کے کلام اور شخصیت کے چند پہلو یہاں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے عرفی ایک ایسا شاعر ہے جس کا خمیر تو ایرانی ہے لیکن بود و باش ہندوستان میں اختیار کر کے اس نے ہندوستانی لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اور یہیں دربار سے منسلک ہوا اور شاعری کو اپنا پیشہ قرار دیا یہ بہت ہی خود دار شاعر تھا جس کی جھلک اس کے کلام میں ملتی ہے۔ عرفی نے مغل بادشاہوں کے دربار میں داد تحسین حاصل کی اور اپنے حریفوں کی چشمک کا بھی شکار رہا جس کا ہر درباری شاعر کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں اس کی نشان دہی کی ہے۔

میں نے پروین اعتصامی کے حالات زندگی اور شاعری کا بھی یہاں جائزہ لیا ہے۔ پروین ایک دولت مند گھرانہ کی چشم و چراغ ہے۔ وہ اعتصام الدولہ کی نور چشم ہے بہت ہی ماز و نعم سے اس کی پرورش ہوئی۔ لیکن اس کے دل میں ملت کا درد موجود ہے اور وہ اپنی نظموں میں اپنے اس احساس کو پیش کرتی ہے۔ اس کی نظمیں ”مردوزن“ اور اشک یتیم، اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ زمانہ ایران کے دورہ مشروطیت کا عوامی زمانہ تھا جب کہ بہت سے اہل قلم سامراجی ظلم و استبداد کے خلاف مظلوم عوام کے درد کو اپنے کلام میں پیش کر رہے تھے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ پروین نے ان نظموں میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو عوام کے لئے اصلی

حالت میں پیش نہیں کیا ہے کیونکہ وہ ایک سامراجی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے لیکن اس کی نظموں کو پڑھنے سے قاری کا یہ تاثر رہتا ہے کہ پروین مظلوم عوام پر جو جبر و استبداد ہو رہا تھا اس سے متاثر تھی اور بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھ کر اپنی شاعری میں اس کی عکاسی کی ہے۔ اب میں کہاں تک ان مضامین کی تیاری میں کامیاب رہی ہوں اس کا تصفیہ تو محترم قارئین ہی کر سکیں گے۔

سب سے پہلے میں اپنے محترم اساتذہ ڈاکٹر رضیہ اکبر، پدما شری ڈاکٹر شریف النساء انصاری، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب اور ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب کی مشکور ہوں۔ جن کی رہنمائی اور نظر عنایت ہمیشہ شامل حال رہی۔ اس تحقیقی کام میں استاد محترم پدما شری امیر حسن عابدی صاحب کی شفقت و استاد محترم عبدالودود اظہر صاحب کی ہمت افزائی کا اثر ہے۔۔۔ اور جب تک کہ میں اپنے مہمان استاد ڈاکٹر ابو القاسم رادفر صاحب کا شکریہ نہ ادا کروں میرا یہ خوشگوار فرض ادا نہیں ہو سکتا آپ نے بعض مضامین کی تیاری میں نہ صرف میری مدد کی بلکہ اس کتاب کا پیش لفظ بھی لکھنے کی زحمت کی۔ میں اردو اکیڈمی حیدر آباد آندھرا پردیش کے چیرمن سکر ہری کی بھی بے حد ممنون ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت میں اکیڈمی کی جانب سے جزدی اعانت کی گئی۔ آخر میں، میں جناب شاہنواز علی مرزا پروپرائٹر ہندوستان آرٹ پرنٹرز کی مشکور ہوں کہ آپ نے ہمت ہی تیند ہی سے اس کتاب کی اشاعت میں تعاون کیا ورنہ میرے لئے یہ کام ناممکن ہوتا۔

ڈاکٹر زب حیدر

شاہنامہ فردوسی کی تاریخ تمدنی

اور

ادبی اہمیت

شاہنامہ سرتاسر ایرانی تاریخ پر منحصر ہے اور یہ ایک طرح سے ایران کی تاریخی سند ہے سامانی دور کے ایران میں وطن دوستی اور قوم پرستی کے جو جذبات تازہ ہو رہے تھے۔ ان کا لازمی تقاضا تھا کہ اپنی پچھلی تاریخ کی قدر و قیمت کو اجاگر کیا جائے۔ سامانی حکمرانوں نے اس طرف خاص توجہ کی اور دقتی کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ وہ ایران باستان کی تاریخ نظم کرے لیکن وہ اس کام کو تکمیل نہ کر سکا۔ اس کی تکمیل فردوسی کے نصیب میں تھی۔ فردوسی صرف شاعری نہیں تھا بلکہ سچا قوم پرست اور وطن دوست بھی تھا۔ اس نے اپنے گرد و پیش کی فضا اور تحریکوں سے گہرا تاثر قبول کیا اور اسی ضمن میں اسے ایران قدیم کی ایک ایسی تاریخ مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا جو موجودہ ایران دلوں میں نئی گرمی اور حرارت پیدا کر سکے۔ اس لگن، و شوق اور شدید وطن دوستی کے جذبہ نے اس سے شاہنامہ لکھوایا جو بلاشبہ ایران کی قدیم تاریخ کا ایک مکمل اور واحد ماخذ نہیں تو بہت بڑا ماخذ ضرور ہے اور اس کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

شاہنامہ ایک تاریخی نظم ہے۔ ایران کی قومی داستانوں اور قدیم تاریخ کو زندہ کرنے اور فارسی زبان میں ایک نئی جان پھونکنے کے لئے ابوالقاسم فردوسی کا کارنامہ بلاشبہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے ایران کے بادشاہوں اور پہلوانوں کی داستان لکھنے کا طریقہ ایران میں قدیم زمانے سے چلا آتا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں لکھا ہے کہ ہخامنشیوں کے زمانے میں بادشاہوں کے حالات اور ان کے کارنامے لکھے جاتے تھے۔ اس طرح شاہناموں میں سے ایک شاہنامہ جو ہمارے زمانے تک پہنچا ہے۔ ”خدائی نامک“ یا ”خدائی نامہ“ پہلوی ہے۔ یہ شاہنامہ سامانیوں

کے دور حکومت میں لکھا گیا اور ایک ایرانی عالم ابن مقفع نے پہلوی زبان سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو آج ناپید ہے۔ ایسی پہلوی کتابیں جو شاہنامہ کا ماخذ ہیں اور ہم تک پہنچی ہیں ان میں ایک کارنامک اردشیر بالکان اور دوسری یادگار زایران ہے، جسے شاہنامہ گشتاسپ بھی کہتے ہیں شاہنامہ کے جملہ ماخذوں میں کتاب اوستا اور اس سے متعلق دوسری کتابیں جیسے بندھیشین اور دینکرت وغیرہ شامل ہیں۔ یزدان اور اہرمن کا قصہ زرتشت سے متعلق روایتیں۔ آفرینیش کی داستان، کیومرث اور کیانی بادشاہوں کی حکایتیں،، ضحاک و فریدون کی کہانیاں، براہ راست اوستا سے لی گئی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان داستانوں میں سے بعض وہ داستانیں ہیں جیسے ضحاک و کاکاہ وغیرہ مشترک آریائی ہند ایرانی داستانوں میں شامل ہو گئی ہیں بلکہ ان کا رشتہ ہند ایرانی دور سے اور آگے بڑھ کر یوریشیائی ہو جاتا ہے۔ شاہنامہ میں رسم و اسفندیار جیسے قصے بھی موجود ہیں۔ ہخامنشی دور کے بعد ایرانی ماخذوں کے سوا دوسرے ماخذ سے جیسے مشرقی ایران یعنی زابلستان وغیرہ سے لئے گئے ہیں۔ فردوسی سے پہلے آخری سامانی شاعر و قافی طوسی تھا جس نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا، لیکن اس کی عمر نے وفات کی اور وہ اسے پایہ تکمیل کو پہنچا نہ سکا۔ دقیق صرف دس ہزار شعر جو ظہور زرتشت سے لیکر جنگ گشتاسپ اور ارجاسپ سے متعلق ہیں لکھ سکا۔ فردوسی نے دقیق کے ان اشعار کو اپنے شاہنامہ میں شامل کر لیا اس کا دعویٰ ہے کہ قدیم زمانہ کی ایک ایرانی بسوط تاریخ موجود تھی۔ لیکن مرتب و مدون نہ تھی، موبدوں یعنی مذہبی پیشواؤں کے پاس اس کے مختلف اجزائے تھے۔ ایک رئیس دہقان نے ہر جگہ سے بوڑھے بوڑھے پراٹم موبد جمع کئے اور ان پر آگندہ اجزاء کو زبانی روایتوں کی مدد سے ترتیب دے کر ایک مکمل کتاب تیار کروائی۔ اسی کتاب کو دقیق نے نظم کرنا شروع کیا تھا۔ چونکہ ناتمام چھوڑ گیا تھا اس لئے خود فردوسی نے اس کی تکمیل کی۔ شاہنامہ کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اکثر نقادوں نے اس کی اس اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر براون اعتراف کرتے ہیں کہ شاہنامہ ساسانی دور اور ایران قدیم کی حقیقی تاریخ پر مبنی ہے۔ رضا زادہ شفق نے بھی اس امر کو ثابت کیا ہے کہ یہ دل بسینہ اور یہ ارجمند دیوان ایرانیوں کی قومی تاریخ کی سند ہے۔

صاحب شعرالچمیوں رقم طراز ہیں۔ ”اگرچہ اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں نے شاہنامہ کو عام نظروں میں تاریخ کے درجہ سے گرا دیا ہے تاہم ایران کی کوئی مفصل قدیم تاریخ اس سے زیادہ صحیح نہیں مل سکتی۔ ہوشنگ مستوفی اپنی کتاب ”شعرائے بزرگ“ ایران میں یوں لکھتے ہیں۔

”در آسمان شعر و ادب ما و از این ستارگان درخشاں بسیار وجود داشت کہ مآتا پایان جہاں ہم پر تو علم و ہنر آہنا محتاج خواہیم بود ولی یکی از آہنا کہ بواسطہ بسنگی بزبان تاریخ ماد عند متی کہ ہمیت ما کردہ است بیش از ہمہ نامش را شنیدہ ام و تمام فارسی زبانان احترام خاصی برایش خواندند و در میان عامہ مردم اشتهار کافی دارد حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی است کہ زندگی خود را وقف احیاء زبان پارسی و تاریخ پر افتخارش خود مانمودہ است“

عطاء اللہ روحی کرمانی اپنی کتاب زبدہ شاہنامہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

”در این دارود گیر فردوسی برخواست و کاخ بلند پایہ ملت لابرآوج داشت دوران بزرگی و عظمت و غرمی و جلالت و آئین و رسوم پیشین را پدید و تمام بزرگان این و شاہنشاہان قہرمان این مرز و بوم را جاوید ساخت و زبان کثیر این پارسی را رونق افراود جلوه اسی سزا بخشید

محمد علی فروغی اپنی کتاب ”منتخب شاہنامہ“ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

”اما شاہنامہ فردوسی ہم از حیث کمیت و ہم از جہت کیفیت بزرگ ترین اثر ادبیات و نظم فارسی است بلکہ میتوان گفت یکی از شاہکار ہای ادبی جہان است و ملل دیگر قدیم و جدید کہ دارای ادبیات معتبر یہ باشد فقط چہار منظوم دارد کہ میتوان با شاہنامہ مقایسہ کرد، شہکار فردوسی اگر برآں مقام برتری داشتہ باشد پست تر سنیت و یقیناً کمتر قومی است کہ از تاریخ ملی خود چہتین روایت کامل زیبای داشتہ باشد۔“

نخستین منت بزرگی کہ فردوسی بر ما دارد احیاء و بقا کی تاریخ ملی ما است

ہر چند جمع آوری میں تاریخ را فردوسی نکرده و عمل او تنہا میں بوده است کہ
کتابی را کہ پیش از رو فراہم آمدہ بنظم آورده است و این ہمیں رو کافی است کہ
اور ازندہ کنندہ آثار گذشتہ ایرانیان شمار آورده چنانچہ خود او نکتہ را متوجہ بوده
و فرمودہ است

عجم زندہ کردم بدیں پارسی

و بس از شمارہ اسامی بزرگانی کدم نام آنھا بریدہ نو بجاساختہ میگوید

چو عیسی من این مردگان را تمام

سراسر ہمہ زندہ کردم بنام

یورپ کی کئی محققوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ فردوسی کا بیان ایرانی تاریخوں سے حرف
بہ حرف مطابق ہے۔ شاہنامہ کا مطالعہ ہم کو بتاتا ہے کہ فردوسی کو اپنی تاریخی ذمہ داری کا اس
قدر لحاظ ہے کہ وہ واقعات کے بیان میں سب سے پہلے اپنا ماخذ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہے۔
چنانچہ اس نے خود واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ شاہنامہ کی اصل بنیاد ایرانی قدیم تاریخ ہے۔
شاہنامہ کے تمام ماخذ یکساں اہمیت نہیں رکھتے۔ یعنی بعض زیادہ مستند ہیں اور بعض اس سے
کم اور بعض اس سے بھی کم اس لئے فردوسی نے اس فرق مراتب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس سے
بہت کر جو واقعات لکھے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کے ماخذ کی بھی تصریح کرتا گیا ہے۔ مثلاً شفا کی
داستان میں لکھتا ہے کہ وہ اس نے خود اس خاندان کی ایک زندہ یادگار سے حاصل کی تھی۔
طلحہ و گیو کی داستان اصل ماخذ میں نہ تھی اس لئے اس کے راوی کا نام تصریح سے بتا دیا ہے۔

چنین گفت فرزاند شاہوئے پیر

ز شاہوئے پیرین سخن بادگیر

جو واقعات پورے ملتے ہیں۔ ان کو من و عن مکمل طور پر ادا کیا ہے۔ فردوسی کے عہد تک
تاریخ نگاری کا یہی انداز غالب ہے۔ کیونکہ اس اور خسرو کے زمانے تک کے جو حالات عام طور پر
دوسری تاریخوں میں بھی ہیں۔ ان میں بھی رزم و جنگ کے سوا کچھ بھی نہیں جس قدر زمانہ
گذرتا گیا اور حالات کی آمیزش ہوتی گئی۔ تاریخ کا تصور بھی بدلتا گیا اور چونکہ نوشیروان قریب

العہد تھا اس لئے ہر قسم کے ملکی انتظامات وغیرہ کی تفصیل زیادہ ملتی ہے اور فردوسی نے بھی ان کو مفصل لکھا ہے۔ فردوسی کا تاریخ کا تصور اس کے عہد کے تمام مورخین کے مقابلہ میں زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے جس کا اندازہ ہم کو خود شاہنامہ کی داستانوں سے ہوتا ہے کہ ہر داستان کے ذکر میں فردوسی نے اس کے راوی کے حوالہ دیا ہے اور حتی الامکان اس امر کا خیال رکھتا نظر آتا ہے کہ اس راوی کے حوالہ سے داستان لکھے جو حقیقت سے قریب تر یا سچا ہے۔

فردوسی نے شاہنامہ کو اگرچہ ایک پائے تخت کے مورخ کی حیثیت سے لکھا ہے تاہم واقعات کے بیان میں اس کے اپنے قومی جذبات کی جھلک نمایاں ہے جو قدیم ایرانی شاہوں کی تاریخ کا بھی جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہنامہ قومی پاسداری کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایران کا اصل مقابلہ توران سے ہے۔ اس لئے تورانی یا تو مغلوب ہوتے ہیں یا اتفاقیہ فتح پاتے ہیں تو گردش زمانہ کا اثر ہوتا ہے۔ عرب کا ذکر شاہنامہ میں اکثر آیا ہے۔ لیکن ایک بھی موقعہ نہیں جو عرب کی تحقیر سے خالی ہو۔ فریدون اپنے بیٹوں کی شاہ یمن کی لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتا ہے شاہ یمن کو دل سے منظور نہیں لیکن فریدون اس کے آگے سرتابی نہیں کر سکتا۔ شاہ نامہ کے جمع کرنے کی تاریخ کے بعد اصل داستان شروع ہوتی ہے۔ پہلے کیومرث کا ذکر کرتا ہے جو اولین داستانی بادشاہ ہے۔ شاہنامہ کے آخر تک پچاس بادشاہوں کے نام آتے ہیں۔ اور ان کے دور کے حالات وزیروں اور پہلوانوں کا ذکر رزم ویزم کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں یہ طویل نظم عربوں کے ہاتھوں ایران کے آخری بادشاہ مزدگرد سوم کی شکست اور ایران پر عربوں کے قبضہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخی وقائع کے لحاظ سے شاہنامہ گویا پچاس فصول پر مشتمل ہے اور ہر فصل ایک بادشاہ کے لئے مختص ہے۔ کیومرث سے لیکر منوچہر کی بادشاہی تک انسانی تمدن، کھیتی باڑی، کھانا کھانے کے آداب، کپڑے پہننے، مکان بنانے اور متمدن زندگی کی دوسری ضرورتوں کے رواج پانے کا بیان ملتا ہے۔ اسی حصہ میں صحاک کا وہ و فریدون کی داستان آتی ہے۔ منوچہر کے زمانے میں سام پیدا ہوتا ہے۔ ژال دنیا میں آتا ہے اس کا بیٹا رستم پیدا ہوتا ہے۔ منوچہر کا بیٹا نوذر سات سال حکومت کرنے کے بعد تورانیوں کے بادشاہ افراسیاب کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔ ہر اب رستم کے لڑنے کا دردناک واقعہ اور

سہراب کا مارا جانا اسی دور میں پیش آیا۔ ایران اور توران کے درمیان جو جنگیں ہوئیں۔ ان میں سے کئی جنگوں میں رستم نے حصہ لیا، آخر کار کیخسرو کے زمانہ میں افراسیاب گرفتار ہو کر مارا گیا۔ اس آخری دور کی اہم ترین داستان بیژن و منیوہ کے عشق کی داستان ہے۔ گشتاسپ کے زمانے میں ایران باستان کا سب سے بڑا پہلوان رستم جو فردوسی کا ہیرو ہے دنیا سے اٹھ جاتا ہے فردوسی کو رستم سے بہت محبت ہے۔ دارا کے دور کے ساتھ سکندر کی داستان شروع ہو جاتی ہے اور غیر ایرانی ماخذوں سے لی گئی ہے۔ اشکانیوں کا حال نہایت اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔ پھر سامانیوں کی داستان شروع ہو جاتی ہے۔ اس میں اس عہد کے اہم تاریخی واقعات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ غرض کہ شاہنامہ قبل اسلام تاجدارانِ مجم کے چار خاندانوں کی اچھی تاریخ ہے۔ پیشہ وادی، کیانی، اشکانی اور سامانی، خاص طور پر شاہنامہ کا حصہ جو ساسانی عہد سے متعلق ہے۔ تقریباً پورا تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ غرض کہ فردوسی نے اپنے خون جگر سے ایران کی یہ بسوط تاریخ نظم کی جو تقریباً ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ بقول محمد علی فروغی فردوسی ایران کی قدیم تاریخ کا احیاء کرنے والا ہے۔ اگر فردوسی اپنے دل نشین انداز میں یہ داستانیں قلمبند نہ کرتا تو آج کوئی بھی ایرانی سوراؤں اور ایرانی بادشاہوں کی تاریخ نہ جانتا کیوں کہ اس سے پہلے جو تاریخیں لکھی گئیں تھیں وہ یا تو پہلوی میں تھیں یا پہلوی سے عربی ترجمے جن کو کوئی ذوق و شوق سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ شاہنامہ کے موثر انداز ہی کا اثر ہے کہ اس کو ہزاروں لوگوں کی زبانوں پر چڑھایا اور آج بھی لوگ بڑے فخر سے اس کو پڑھتے ہیں۔ علامہ شبلی نے شاہنامہ کو قدیم ایران کی ایک اچھی انسائیکلو پیڈیا کہا ہے جو شاعرانہ انداز میں ہے اور یہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ بے شک شاعر نے تاریخی غلطیاں بھی کی ہیں۔ اور کچھ ایسے واقعات بھی قلمبند کر دئے ہیں جو بالکل بے بنیاد ہیں۔ لیکن باوجود ان کے ہم کو جتنے تاریخی معلومات شاہنامہ سے حاصل ہوتے ہیں خود ایرانیوں کی کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ زمانہ کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے جو نمونے ہمیں شاہنامہ میں دکھائی دیتے ہیں وہ بہت کم کہیں اور دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا تنوع اور مختلف جگہوں کے واقعات اور حالات ساتھ ہی انسانی زندگی کے مختلف رشتوں اور جذبات و احساسات کا بیان جیسے عشق

و محبت، غم و غصہ وغیرہ ان سب چیزوں نے مل کر شاہنامہ کو بہت ہی دلچسپ کتاب بنا دیا ہے یوں تو شاہنامہ کا ہر شعر زبان و بیان کے لحاظ سے شستگی رکھتا ہے۔ لیکن واقعات کے بیان میں فردوسی نے جو کمال دکھایا ہے۔ وہ یقیناً اسی کا حصہ ہے۔ وہ تنہا شاعر ہے جس نے واقعہ نگاری کو محاکات کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ جذبات نگاری میں بھی اس کو مہارت حاصل ہے لیکن اس میں نظامی جیسی گہرائی نہیں۔

شاہنامہ میں جہاں رسم کا ذکر آتا اور اس نے عورتوں کے رتبہ کا معیار بلند قائم کیا

وحکمت میں ”عدیم القرین“ لکھا ہے۔

خیام فلسفہ یونان کا درس دیتے تھے۔ اس کا اثر لوگوں کے اسلامی عقائد پر پڑا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے خیام کو بے دین قرار دیا۔ جس پر انہوں نے مجبوراً زبان و علم کو ایک عرصہ کے لئے تھام لیا۔ چونکہ لوگوں نے ان کے قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ حج کو روانہ ہو گئے۔ واپسی میں جب بغداد پہنچے تو لوگ ہر طرف سے آنے لگے۔ تاکہ علم فلسفہ سیکھیں لیکن خیام نے انکار کر دیا حج سے فارغ ہو کر وطن آئے اور عبادت میں مصروف ہو گئے۔

لغات اور ادبیات عربی میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ لٹری ہسٹری آف پرشیا میں فردوس التواریخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ابو الحسن مہمتی اور خیام کے درمیان دیوانہ حماسہ کے ایک شعبہ پر بہت طویل بحث ہوئی۔ جس سے ادب عربی میں ان کے علمی مراتب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حکیم صاحب کی قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ اصفہان کے مقام پر آپ نے ایک کتاب کو ساتھ مرتبہ پڑھا اور جب نیشاپور واپس آئے تو پوری کی پوری کتاب زبانی لکھوا دی۔ صرف چند الفاظ کا فرق تھا۔ فلکیات میں بھی خیام کو خاص مہارت حاصل تھی۔ نظامی عروضی سمرقندی لکھتا ہے کہ ۵۰۸ھ کے موسم سرما میں بادشاہ نے خواجہ بزرگ صدر الدین محمد بن الظفر کے پاس مرو میں قاصد روانہ کیا کہ خیام سے استفسار کرے کہ وہ اعمال نجوم کے ذریعہ کوئی ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف و بارش سے محفوظ ہو۔ خیام نے دو دن تک اس معاملہ پر غور و فکر کر کے دن مقرر کر دیا۔ بادشاہ شکار کے لئے روانہ ہوا ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ بادل اٹھے اور برف گرنی شروع ہوئی لوگوں نے اس پر خیام کی ہنسی اڑائی اور چاہا کہ واپس ہو جائیں لیکن خیام نے کہا کہ ابھی بادل رک جائیں گے اور پانچ دن تک زمین نم بھی نہ ہوگی ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور لوگوں نے پانچ دن تک بادل کی شکل بھی نہ دیکھی۔

افسوس ہے کہ خیام کے علمی کارنامہ باقی نہ رہے چند تصانیف جن کا ابھی تک پتہ چلتا ہے وہ تقویم جلالی اربع الج ملک شاہی، عرائس التناس، الجبرایزبان عربی، علم طبعیات میں ایک رسالہ، ایک مختصر رسالہ ”دربارہ حکمت الخائق فی خلق العالم خصوصاً الانسان وتکلیف الناس

بالعبادات" یہ رسالہ مصر میں چھپ گیا ہے اور ایک رسالہ بھی مصر میں چھپ گیا ہے۔
 خیام کے دربار شاہی سے تعلقات کے متعلق شبلی لکھتے ہیں۔ "سلاطین و امراء اس سے
 برابری کا برتاؤ کرتے تھے شمس الملوک خاقان بخاری اس کو تخت پر اپنے برابر بٹھاتا تھا ملک شاہ
 سلجوقی دنیائے اسلام کا شہنشاہ اعظم تھا، اس سے مدد مانہ تعلقات رکھتا تھا۔ دولت شاہ نے لکھا
 ہے کہ سلطان سنجر بھی اس کو اپنے تخت پر بٹھایا تھا۔ لیکن شہزوری کی تاریخ الحکماء میں لکھا ہے
 کہ سنجر کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ شہزوری نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ جس
 زمانہ میں سنجر شہزادہ تھا اس کو چچک نکلی خیام معالجہ کے لئے طلب ہوا۔ وزیر نے خیام سے
 پوچھا کہ بیمار کی کیا حالت ہے؟ خیام نے کہا آثار اچھے نہیں۔ یہ خبر کسی نے سنجر کو پہنچائی۔ اس
 کو نہایت رنج رہا سو کبھی دور نہ ہوا۔

خیام صاحب اولاد تھے۔ دولت شاہ لکھتا ہے "نسب شاہ نور الحکیم عمر خیام می رسد"
 (شاہ نور کا نسب خیام سے تعلق رکھتا ہے۔)

خیام کی صفات کے متعلق ایک عجیب قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز آپ بو علی
 سینا کی کتاب "الشفاء" کا مطالعہ کر رہے تھے جب وحدت و کثرت کی بحث پر پہنچے تو کتاب ہاتھ
 سے چھوٹ گئی۔ نماز پڑھی اور یہ کہتے ہوئے جان دے دی کہ "اے خدا! میں نے تجھ کو اپنی
 طاقت کے مطابق پہچاننے کی کوشش کی تو مجھے بخش دے کیونکہ تیرے متعلق میرا جتنا علم ہے
 میری طاقت کے مطابق اتنا ہی ہو سکتا تھا۔" تاریخ وفات ۱۵۷۰ء بتائی جاتی ہے۔

کلام :-! حکیم صاحب کی شاعری کا تمام تر سرمایہ ایک مجموعہ رباعیات ہے جو افق مشرق
 و مغرب پر ماہ کامل کی طرح درخشاں ہے۔ سوائے ایک قطعہ کے اور کوئی فارسی نظم ان کی
 یادگار اس وقت موجود نہیں یا تو سوائے رباعی کے انہوں نے کچھ لکھا ہی نہیں یا باقی تصانیف
 کسی طرح جو تھوڑا بہت لکھا بھی تھا زمانہ کی دستبرد سے تلف ہو گیا۔ البتہ عربی زبان میں بہت
 شعر لکھے ہیں۔

خیام نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے رباعی ہی کو منتخب کیا۔ اس زمانہ میں رباعی کا
 رواج بھی زیادہ تھا۔ ان سے پہلے رباعی گو شعراء میں شہید بلخی، ابو سعید ابوالخیر، رودکی،

ابو شکور ملخی گذرے ہیں لیکن ان سب کے مقابلہ میں صرف خیام ہی کی رباعیات مشہور و مقبول ہوئیں۔ ان کی رباعیات میں گلاب کی رنگینی شبنم کی نزاکت اور قوس قزح کی مسکراہٹیں جمع ہیں بعض وقت سادگی اور انداز بیان سے بلندی مطالب کے متعلق غلط فہمی ہوتی ہے۔ غور سے مطالعہ کیا جائے تو پڑھنے والا خود کو فکر و نظر کی دوسری دنیا میں پاتا ہے۔

خیام کی رباعیات اگرچہ سینکڑوں ہیں لیکن سب کی قدر مشترک صرف چند مضامین ہی ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، خوشدلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر و قدر، توبہ و استغفار ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ کہتا ہے۔ لیکن ہر دفعہ کچھ اس طرح تبدیل کرتا ہے کہ روح تو وہی رہتی ہے پیکر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

ہم کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ یہ سوالات ایسے ہیں جو کسی فلسفی سے حل نہ ہو سکے اور کسی نکتہ رس کے ناخن تدبیر نے اس گرہ کو نہ کھولا ہو اور آخر کار سب کو یہی کہنا پڑا "معلوم شد کہ بیچ معلوم نہ شد" اس حیرت خانہ میں اگر فلسفی سرگردان ہو جاتا ہے۔ خیام تو حکیم بھی تھے اور فلسفی بھی۔ تمام عمر یہی سوچا کئے۔ میں کیا ہوں؟ میری ابتداء کیا ہے اور انتہاء کیا ہے؟ کبھی کہتے ہیں ہم جس دور میں آتے اور جاتے ہیں ہمیں اس کا آغاز معلوم ہوتا ہے نہ انجام۔ کوئی شخص یہ بیان نہ کر سکا کہ ہم کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں۔ یعنی پردہ اسرار میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ اس معما سے کوئی واقف نہیں اور انسان کی مستقل رہائش خاک کے اندر ہے لیکن افسوس کہ یہ فسانہ طویل ہے۔

دور پردہ اسرار کسی راہ نیست

زیر بقیہ جاں بیچ کس آگاہ نیست

جز در دل خاک بیچ منزلگاہ نیست

افسوس کہ این فسانہ ہم کوتاہ نیست

اجرام فلکی اور کائنات کی تخلیق کے متعلق کہتے ہیں۔

آغاز دوان گشتن این زریں مماس

وانجام خرابی چتیں نیک اساس

دانستہ نمی شود بمعیار عقل

سنجیدہ نمی شود بمقیاس قیاس

ازل کے اسرار کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کو نہ تو جان سکتا ہے اور نہ میں یہ معتمد تیری سمجھ میں آسکتا ہے نہ میری سمجھ میں۔ من و تو کی باتیں پردے کے باہر کی باتیں ہیں جب پردہ اٹھ جائے گا تو نہ تو باقی رہے گا اور نہ میں

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من

این حرف معتمد نہ تو خوانی و نہ من

ہست از پس پردہ گفتوئے من و تو

چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

الہیات میں تمام عمر غور و فکر کرنے کے بعد انسان کو آخر کار یہی کہنا پڑتا ہے ہم پوری طرح جیسا چاہیے تھا تجھے نہ پہچان سکے کہتے ہیں۔

کس را پس پردہ قفا راہ نہ شد

در سر خدایچ کس آگاہ نہ شد

ہر کس نہ سر خیال چیزی گفتند

معلوم نہ گشت وقصہ کوتاہ نہ شد

یعنی اسرار الہی سے کوئی شخص واقف نہ ہو سکا ہر ایک اپنی عقل کے مطابق کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہے۔ لیکن حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔

خیام نے مسئلہ وحدت الوجود کی ایک نئی ہی تعبیر کی ہے۔ کبھی کہتے ہیں تمام عالم ایک شخص ہے۔ خدا اس کی روح ہے فرشتے اس کی حسین ہیں اور باقی کائنات اس کے اعضاء۔ کبھی خدا کو جہاں کی جان اور کبھی خود کو جہاں کی جان کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں میں اور تو پرکار کا نمونہ ہیں۔ ہمارے سرِ عمدہ ہیں لیکن جسم ایک دائرہ کی طرح ہم ایک نکتہ پر رواں ہیں۔ آخر کار ہم پھر مل جائیں گے۔ کبھی کہتے ہیں خدائے حاضر و ناظر کا میں ہی مظہر ہوں اس لیے تیرا مسجود ہوں۔

درمن کہ زچہ رونی گشتہ ساجد ما
 بت گفت بہ بت پرست کاے عابد ما
 بر ما جمال خود تحلی کردہ است
 آنکس زلت ناظر وشاہد ما

اس میں شک نہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے دل میں عشق رکھتا ہے اور محبوب حقہ کے بحر میں ہمیشہ تڑپتا و مضطرب رہتا ہے۔ حیوانات کے دل اگر اس کے عشق سے مخمور ہیں جمادات و نباتات بھی اس طرح سے عاری نہیں کہتے ہیں کہ چاند و سورج کو ہر شخص سمجھ رہے کہ صرف اپنے ہی پاس ہے لیکن درحقیقت وہ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ اس طرح محبوب حقہ کو ہر شخص صرف اپنا ہی سمجھتا رہے لیکن وہ تمام عالم کا معشوق کبھی کہتے ہیں کہ محبوب حقہ کے عشق کے سورج نے تو ہر ایک ذرہ کے ہاتھ میں چراغ دیا ہے کبھی کہتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز نہیں جو محبوب حقیقی کے مذاق سے خوں نہ ہو۔ کوئی صاحب نظر ایسا نہیں جو اس کا شیدائہ ہو اس لئے کہ تجھے کسی کا سودا نہیں۔ پھر بھی ایسا کوئی سر نہیں جس پر تیرا سودا نہیں۔

پر خون ز فرقت جگر نیست کہ نیست
 شیدائے تو صاحب نظری نیست کہ نیست
 بآنکہ نداری سر سودائے کے
 سودائے تو بیچ سرنیست کہ نیست

خیام کے دل پر دنیا کی بے ثباتی کا بہت اثر تھا۔ ہستی مستعار کا یہ پہلو ہمیشہ ان سامنے رہا۔ اس مضمون پر ان کے رباعیات کی کثرت اس کا صاف پتہ دیتی ہے کہ وہ اپنے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد شاہ و گدا میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ دونوں کی مٹی یک جا گوندھی جاتی ہے اور اس سے ساغر بنتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں یہ پراں سرائے جس کا نام دنیا ہے اور جو ابلق صبح و شام کی آرام گاہ ہے۔ یہ ایسی بزم ہے جس میں صد جمشید آئے اور چلے گئے اور ایک ایسا قصہ ہے جو کئی بادشاہوں کا تکیہ گاہ رہ چکا ہے۔

ع این کہنہ رباط را کہ عالم نام است
 آرآگہ ابلق صبح و شام است
 بزیت کہ واماندہ صد جمشید است
 قصریت کہ تکیہ گہ صد بہرام است
 حکیم صاحب شاعر تھے انہیں واعظوں سے نفرت ترکہ میں ملی تھی کہتے ہیں۔

اے خواجہ یکی کار روا کن مارا
 دم درکش و در کار خدا کن مارا

ما راست رویم لیک تو کج ماہینی

رو چارہ دیدہ کن رہا کن مارا

بچے دوستوں کی ہمیشہ کمی رہی ہے اور ہر زمانہ کے لوگ اپنے دوستوں کی بے وفائی کی
 شکایت کرتے آئے ہیں۔ خیام یوں رقم طراز ہیں۔

شد دعوی دوستی دریں دیر حرام
 الفت زبد کردی کہ دوست کدام

دامن زہمہ کشیدن اولی باشد

از دور بہر یکی سلام است و کرام

عاشق خدا کو یہ جواب دیتا ہے کہ اگر مجھے عشق سے منع کیا ہے۔ دنیا میں حسن کیوں
 پیدا کیا۔ خیام بھی کہتے ہیں کہ اے خدا تو نے محبوب کو استنا خوبصورت بنایا اور مجھے حکم دیتا ہے
 کہ اس کی طرف نہ دیکھ جب میں گوشہ عدم میں سویا ہوا تھا تو نے حکم دیا کہ اٹھ جہاں میں جا
 اور شور پیدا کر میں نے تیرے حکم کے مطابق عمل کیا۔ اب اس پر حیران ہوں۔

شعرا ہمیشہ آسمان کی سفلہ پروری کی شکایت کرتے آئے ہیں۔ خیام کا بھی خیال اس

اے دہر بہ کردہ ہائے خود معترضی

در خانقہ جور و ستم محکفی

نعمت بچناں دی وہ رحمت بمکساں

زین ہر دو برون نیست دری یا خضری

خیام عیش امروز کو غم فردا پر ترجیح دیتے ہیں اور وہ شراب کو اندوہ رہا تصور کرتے ہیں کہتے ہیں کہ دل میں غم کا پودا نہیں لگانا چاہیے دنیا کا غم فصول ہے عقل مند آدمی دنیا کا غم نہیں کھاتا۔ بلکہ اس کی آگ کو شراب سے بجھاتا ہے کہتے ہیں۔

می خور کے مدام راحت روح تو است

آسائش جان و دل مجروح اوست

طوفان غم از دلبر آید از پیش ست

دربادہ گریز کشی نوح تو است

خیام نے جہاں رباعیات میں زندانہ مضامین باندھے ہیں۔ وہیں حکمت و اخلاق کے صدا ہائیاں موتی بھی پروئے ہیں کہتے ہیں کہ دنیا میں تجھ سے زیادہ مصیبت زدہ ہیں ان کی طرف دیکھ اور اللہ کا شکر بجالا۔ تکلیف میں صبر کر اور خوش رہ۔ انسان کو نفسانی خواہشات میں بسلانہ رہنا چاہیے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دنیا میں کس لئے بھیجا گیا ہے۔ نفس کو کتا کہا ہے۔ دنیا کا یہ حال ہے کہ اپنے عیبوں پر تو کسی کی نظر نہیں اور دوسروں کی عیب جوئی کی جاتی ہے حکیم صاحب نے غفلت کو ترک کرنے اور عمل کی تلقین کی ہے وہ مادی چیزوں کو بیچ سمجھتے ہیں۔ نااہل دوست کی دوستی کو مذموم حرکت قرار دیتے ہیں۔ خوشامد کو زہر تصور کرتے ہیں۔ کہتے ہیں جب تک جان میں جان ہے خدا پر توکل کرو نہ دشمن سے ڈرو نہ دولت کے دست عکس رہو۔ دنیا میں عجز و انکساری کے ساتھ گوشہ گنہاں اختیار کرو۔ خود پسند نہ ہو۔ خیام نے بلند مرتبہ ہونے کے لئے تین چیزیں ضروری خیال کی ہیں۔ ایک انسان کم آزار ہو دوسرا موت سے نہ ڈرو۔ تیسرا یہ کہ روزی کے لئے سرگرداں نہ ہو۔

خواہی کہ ترا رتبہ ابرار رسد

پسند کہ کس را ز تو آزار رسد

از مرگ پندیش و غم رزق مخور

پس ہر دو بوقت خویش ناچار رسد

حصول مراد میں تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں اور کرنی چاہیے۔ انسان دوسروں کا انجام دیکھ کر عبرت حاصل کرے کہتے ہیں تیری ابتدا بھی عدم انتہا بھی عدم اس چند روزہ زندگی میں تو کیا کچھ کرے گا۔ جن مضامین میں انسان ماہر نہ ہو اس کے بارے میں زبان نہ کھولے۔ احسان کی ترغیب دی ہے۔ اگر دوسروں سے نیکی کا سلوک کرے تو انجام بخیر ہوگا۔ دنیا کی سب چھوٹی بڑی چیزیں فانی ہیں۔ دنیا میں جس چیز سے زیادہ محبت ہو وہی زیادہ باعث تکلیف ہے اگر کوئی دوسروں کو ناخوش کر کے خود خوش ہو نا چاہتا ہے تو وہ بڑا نادان ہے۔

یہ جانتے تھے کہ باغ دنیا کی بہار چند روزہ ہے عہد غم میں باد صرصر کے جھونکے آخر کار اس گلشن کی شادابی کا خاتمہ کر دیں گے۔ خیام کے اس کلام موضوع پر اس قدر ہیں کہ کسی شاعر کے کلام میں اس کا اعادہ اس کثرت کے ساتھ نہیں رکھتے ہیں۔

آمد سحر ندا از میخانہ ما

کای رند غراباتی دیوانہ ما

بر خیز کہ پر کنیم پیمانہ ما

زاں پیش کہ پر کنند پیمانہ ما

کہتے ہیں کہ وقت کے ایک لمحہ کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اسے غنیمت سمجھو اور خوشی سے گزارو۔ چاندنی رات میں شراب پیو کہ اس سے بہتر وقت کوئی نہیں۔ وہ خوشگوار لمحوں میں جب کہ چاندنی رات ہو یا موسم گل و روز ابر ہو۔ جو شراب اور نگار کا ساتھ ڈھونڈتے ہیں کہتے ہیں کہ انسان کو معطل نہیں رہنا چاہیے۔ یا تو عبادت الہی میں مشغول ہو جائے یا عیش و عشرت میں محو۔

مہتاب ہنوز دامن شب بے تکافت

مئی خور کہ دی خوشتر از آن نتوان یافت

خوش باش و پندیش کہ مہتاب ہی

اندر سرخاک یک یک خواہد تافت

شراب کے متعلق لکھتے ہیں کہ شراب پی حیات جاوداں یہی ہے۔ شراب آب حیات ہے
مٹی پہ ڈالو تو زندہ ہو جاتی ہے شراب اس لئے تلخ ہے کہ میری زندگی ہے کیونکہ میری زندگی
ہمیشہ تلخ رہی ہے۔

امروز کہ نوبت جوانی من است

می نوشم از آن کہ کامرانی من است

عیش مکنید اگرچہ تلخ است بس است

تلخ است از آنکہ زندگانی من است

خیام شراب حکیمانہ انداز سے پیتے ہیں۔ انہوں نے مے نوشی کے لئے تین ضابطے مقرر
کئے ہیں۔ شراب کس کے ساتھ پینی چاہیے؟ کب پینی چاہیے؟ کتنی پینے چاہیے؟ فرماتے ہیں۔
گر بادہ خوری توبہ خرد مندان خور
یا با صم لالہ رخ وہ خنداں خور

بسیار مخور ورد مکن فاش مساز

اندک خور و گہ خور و پہناں خور

عشق عاشق کو آلائشوں سے پاک کرتا ہے عاشق کو چاہیے کہ ہمیشہ شیدار ہے۔ دیوانہ و
شوریدہ رہے۔ مستان عشق عقل کی پابندی نہیں کرتے۔ بلکہ عقل ان کی پیروی کرتی ہے۔
عشق کی بد مستی کو عقل کی ہوشیاری سے بہتر بناتے ہیں۔

توبہ اور استغفار ایک فرسودہ مضمون ہے لیکن خیام اس کو جس طرح بیان کرتا ہے
سننے والوں کے دلوں کو تڑپا دیتا ہے اور ان کے چشم گریاں ہو جاتے ہیں بعض جگہ ایسی دلیلیں
دیکر دعا مانگتے ہیں جس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ مغفرت کی دعا مانگتا ہے۔ لیکن اپنے لئے نہیں
بلکہ دوسروں یعنی ہاتھ اور پاؤں کے لئے۔ توبہ و گناہ کا اعتراف دیکھئے کس شان سے کرتا ہے۔

یا رب اگر من گناہ یجد کردم

برجان و جوانی و تن خود کردم

چوں برکرمّت و ثوق کلی دارم
 برگشتم و توبہ کردم و بد کردم
 مشہور ہے کہ ایک دن خیام کی صراحی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی اس نے
 رباعی کہی۔

ابرین مے مرا شکستے ربی
 برمن در عیش را برستی ربی

برخاک برینختی مے گلگون مرا
 خاکم بدہن کہ سخت مستی ربی

کہتے ہیں اس گستاخی پر ان کا چہرہ سیاہ ہو گیا انہوں نے پھر مندرجہ ذیل رباعی پڑھی۔
 جس کے بعد ان کا چہرہ دوبارہ نورانی ہو گیا۔
 ناکرذہ گناہ درجہاں کیست بگو
 وآن کس کہ گناہ نہ کردچوں زیست بگو

من بدکنم و توبہ مکافات دی
 پس فرق میاں من و تو چیست بگو

خیام کے کلام کی عظمت، شیرینی اور ہمہ گیری کا اندازہ نقادوں کے اس بیان سے ہوتا
 ہے کہ فارسی زبان کو غیر زبان والے اس لئے پڑھتے ہیں کہ گلستان سعدی، شاہنامہ فردوسی،
 دیوان حافظ اور رباعیات خیام کا مطالعہ کریں ان کی درخشاں روشنی میں اپنی حیات کا تابناک
 لائحہ عمل تجویز کریں۔

سعدی شیرازی

اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر سمیع الدین احمد کی کتاب نقد ادبیات فارسی کے مہیاچہ میں سعدی سے متعلق لکھتے ہیں کہ

”فارسی زبان و ادب میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کا شمار صف اول کے شاعروں کے علاوہ صف اول کے نثر نگاروں میں بھی کیا جاتا ہے۔ انگریزی، عربی اور اردو زبانوں کی طرح فارسی میں بھی دو طرح کے اسالیب کا چلن رہا ہے یعنی ایک مرصع اور مزین اور بلند آہنگ اسلوب اور دوسرا سادہ بے میل تصنع اور عبارت آرائی سے مستثنیٰ اسلوب۔ انگریزی میں سرنامس براون اور عربی میں مقامات حمیری اور کلید و دمنہ کے مصنفین کا انداز نگارش اور اردو میں رجب علی بیگ سرور اور غالب اور حالی دونوں انداز کے نمائندے کہے جاسکتے ہیں۔ سعدی دوسری قسم کے نثر نگاروں کے زمرے کے سرخیل کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی نثر میں حلاوت، دلآویزی اور برجستگی ہے۔ ان کی شاعری و نثر دونوں میں تنوع اور گوناگوں تجربات کی کشید ملتی ہے۔ انہوں نے زندگی اور زمانے میں اپنی بصیرتوں کو اپنے خون میں حل کر کے انہیں صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ سعدی کی شاعری اور نثر کا مابہ الاتیاز عنصر وہ دانائی ہے جسے تجربات زندگی کا عطر کہا جاسکتا ہے۔ یہی ان کی تحریروں کو جلا بخشتا ہے۔ اور یہی ان کی آفاقیت پر سب سے بڑی دلیل ہے۔ ان کے یہاں عبارت کی گراں باری نہیں ہے۔ بلکہ الفاظ ایسے صاف و شفاف ہیں کہ ان کے اندر سے مفہوم کی وسعت اور گیرائی دیکتی ہے اور وہ انشراح قلب کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔“

ملک الشعرا بہار مشہدی نے جامع الفاظ میں ان کی بڑائی کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں:-

”----- سدی بزرگتر از آنست که لازم باشد در تعریف وی صرف وقت کنیم، چه دفتری نیست که از ذکر جمیل و شرح احوال بزرگواری خالی باشد“
(سبک شناسی، ج ۳ صفحه ۱۱۱)

حیات سعدی میں حالی نے بجا طور پر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ "ہم نے سب سے اول شیخ کا حال اس لیے لکھا ہے کہ ہندوستان میں اس سے زیادہ کوئی مسلمان مصنف مقبول و مشہور نہیں ہے اور خاص کر فارسی زبان کے شعرا میں میرے نزدیک کوئی شاعر اس کے رتبہ کو نہیں پہنچا" (حیات سعدی لاہور ۱۹۳۸ء ڈیٹیشن صفحہ ۶)

علی دشتی لکھتے ہیں:-

”جنبہ حائی گونا گوں سعدی نگارش دربارہ ویرادشوار می کند“ (قلمرو سعدی صفحہ ۱۷)

دکتر ذبیح اللہ صفّا، استاد ممتاز دانش گاہ تہراں نے سجدی کے نام و نسب اور تاریخ وفات کے بارے میں جو مختلف اقوال ملتے ہیں ان کا ذکر ضمیمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”در نام و نسب و تاریخ وفات این استاد بزرگ میان نویسندگان و مولفان قدیم اختلافست و گمان می رود که علتی الحاصل این اختلاف امری جز کثرت شهرت سعدی و افتادن نام بلندش در افواه خواص و عوام نیست - بنابر آنچه از تحقیق در مانعذ موثق قدیم برمی آید نام و نسب درست او همانست که در آغاز این مقال آورده ام اما اگر نخواهیم بسیری در مانعذ مختلف درین باب پردازیم واقعاً دچار حیرت و سرگردانی می شویم ---“ (تاریخ ادبیات در ایران جلد ۳ بخش اول صفحه ۵۸۶)

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اپنی کتاب نقد ادبیات فارسی کے (صفحہ ۱۱) پر سعدی کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں۔ شیخ نے اپنی تخلیقات کا جو نثری و شعری سرمایہ چھوڑا ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے سادہ نگاری کے ذیل میں آتا ہے۔ اور اس کے گردشکال و اخلاق اور بلاغت کے دیز پردے حائل ہیں اور یہ سرمایہ بیشتر حکمتوں اور سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ لہذا

اس تخلیق کے پس منظر میں ان کو یا ان کے ادبی کارناموں کو سمجھ لینا بظاہر کوئی مشکل امر نہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہی سادگی اور سادہ نویسی ان کے افکار و معانی کے ثروت و عمق کا ستہ دیتی ہے۔ جتنا کھنگلیے اور تلاش و جستجو سے کام لیجئے اتنے ہی لطائف معانی کے آبدار موتی ہاتھ آتے ہیں۔

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اپنی کتاب "نقد ادبیات سعدی" (دلی ۱۹۸۲ء، صفحہ ۲۰) پر لکھتے ہیں کہ "یہ بات اب آزادی تحقیق موثق داخلی شہادتوں کی روشنی میں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ شیخ سعدی کی پیدائش ۴۰۶ھ کے حدود میں ہوئی اور چونکہ سال وفات یقینی طور پر ۶۹۱ھ یا ۶۹۲ھ ہے لہذا ان کی عمر پچاسی سال کے لگ بھگ ہوئی ہے چونکہ تحقیقی سطح پر ان تمام مسائل و مباحث کی چھان بین ہو چکی ہے اور یہ مصدقہ امور ہیں لہذا ان پر مزید اظہار خیال کی ضرورت نہیں" حالی نے اپنی کتاب حیات سعدی (۲۶۳) پر لکھا ہے کہ "اس کی عمر ایک سو دو برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔ کسی نے شیخ کی عمر ایک سو دو برس کسی نے ایک سو دس برس اور کسی نے ایک سو بیس برس لکھی ہے۔"

سعدی کا نام شرف الدین اور مصطلح لقب اور سعدی تخلص تھا۔ سرگور او سلی نے اس کی ولادت ۵۸۹ھ ۱۳۳۲ء لکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے اتابک مظفر الدین شاہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ وہ ایک باخدا مرد تھا۔ شیخ کو بچپن ہی سے عبادت کا شوق تھا۔ سعدی کے باپ کا سایہ کسنی میں سر سے اٹھ گیا تھا اس کی تربیت ماں نے کی سعدی نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اس کے قرب و جوار میں علماء و مشائخ اور فصحاء و بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور ان سے بھی زیادہ جم غفیر کا شہرہ جو خط فارس میں اہل کمال ہو کر گذرے تھے بزرگوں سے سنا تھا۔ اس لیے تحصیل علم کا شوق ان کے دامن گیر ہوا۔

چونکہ شیراز میں اطمینان نصیب نہ تھا۔ سعدی نے ترک وطن کا ارادہ کیا شیخ نے ابن جوزی کے آگے نظامیہ بغداد میں زانوئے ادب تہہ کئے۔ سرگور او سلی نے لکھا ہے کہ اس نے شیخ کی ایک نظم دیکھی ہے جس کو اٹھارہ مختلف ملکوں کی زبانوں میں لکھا گیا ہے۔ جہاں وہ

کو گئے تھے۔ شیخ کی وفات ۶۹۱ھ میں ہوئی۔

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے ان کی اصلی رائے کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا نقل کیا ہے۔ جس میں فردوسی کو شنی کا انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا ہمیر قرار

۶۔

در شعر ~ کس ہمیر اند

مر چند کہ لابی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را

فردوسی ، انوری و سعدی

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی کو اپنی شنی نہ سپہر میں غزل کا استاد مانا ہے مگر اصناف سخن میں ان کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ایک شعر میں مطلقاً شیخ کے تتبع پر فخر کیا

خسرو سرمست اندر ساغر معنی برہخت

شیرہ از میخانہ مستی کہ در شیراز بود

امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس زمانے کے اہل ذوق سعدی ہندوستان کہتے تھے شیخ پر افتخار کیا ہے۔

حسن گلی ز گلستان سعدی آوردہ است

کہ اہل معنی گلچیں ازیں گلستان اند

کلام شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں ایک حکمت مشہور ہے کہ مشائخ وقت میں سے رگ شیخ کے منکر تھے ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ راہے؟ سعدی شیرازی نے کہا ”ایک بیت سعدی شیرازی نے کہی ہے جو جناب الہی میں ہوئی یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے۔“

سیاحی کو گئے تھے۔ شیخ کی وفات ۶۹۱ھ میں ہوئی۔

اکثر جلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے ان کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبدالرحمن جامی نے بہارستان میں کسی شاعر کا قطعہ نقل کیا ہے۔ جس میں فردوسی کو شنوی کا انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے۔

در شعر سہ کس پیمبر اند
ہر چند کہ لانی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را
فردوسی ، انوری و سعدی

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدی کو اپنی شنوی نہ سپہر میں غزل کا استاد مانا ہے لیکن دیگر اصناف سخن میں ان کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ایک شعر میں مطلقاً شیخ کے تتبع پر فخر کیا ہے۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از میخانہ مستی کہ در شیراز بود

امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس زمانے کے اہل ذوق سعدی ہندوستان کہتے تھے شیخ کے تتبع پر افتخار کیا ہے۔

حسن گلی ز گلستان سعدی آوردہ است
کہ اہل معنی گلچیں ازیں گلستان اند

کلام شیخ کی مقبولیت کے ذکر میں ایک حکایت مشہور ہے کہ مشائخ وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر تھے ایک رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر مازل ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ سعدی شیرازی نے کہا ”ایک بیت سعدی شیرازی نے کہی ہے جو جناب الہی میں مقبول ہوئی یہ اس بیت کا صلہ ہے اور وہ بیت یہ ہے۔“

اس تخلیق کے پس منظر میں ان کو یا ان کے ادبی کارناموں کو سمجھ لینا بظاہر نہیں لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہی سادگی اور سادہ نویسی ان کے افکار و معانی کے ستارے دیتی ہے۔ جتنا کھنگلیے اور تلاش و جستجو سے کام لیجئے اتنے ہی لطائف معانی ہاتھ آتے ہیں۔

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اپنی کتاب ”نقد ادبیات سعدی“ (دلی ۱۹۸۴ء، صفحہ ۱۰) کہ ”یہ بات اب آزادی تحقیق موثق داخلی شہادتوں کی روشنی میں پایہ ثبوت کہ شیخ سعدی کی پیدائش ۶۰۶ھ کے حدود میں ہوئی اور چونکہ سال وفات یقینی طور پر ۶۹۲ھ ہے لہذا ان کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ ہوئی۔ چونکہ تحقیقی سطح پر ان و مباحث کی چھان بین ہو چکی ہے اور یہ مصدقہ امور ہیں لہذا ان پر مزید اظہار ضرورت نہیں“ حالی نے اپنی کتاب حیات سعدی (۲۶۴) پر لکھا ہے کہ ”اس کی عمر برس سے زیادہ تسلیم کرنی چاہیے۔ کسی نے شیخ کی عمر ایک سو دو برس کسی نے ایک سو برس اور کسی نے ایک سو بیس برس لکھی ہے۔“

سعدی کا نام شرف الدین اور مصلح لقب اور سعدی تخلص تھا۔ سرگور او کی ولادت ۵۸۹ھ ۱۳۳۲ء لکھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے بہت پہلے آتابک شاہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعدی خدمت پر مامور تھا۔ وہ ایک باخدا مرد تھا۔ شیخ کو بچپن ہی سے عبادت کا شوق تھا۔ باپ کا سایہ کسی میں سر سے اٹھ گیا تھا اس کی تربیت ماں نے کی سعدی نے ہوش سنا شیراز اور اس کے قرب و جوار میں علماء و مشائخ اور فصحاء و بلغا کی ایک جماعت کثیف سے دیکھی تھی اور ان سے بھی زیادہ جم غفیر کا شہرہ جو خط فارس میں اہل کمال ہو کر تھے بزرگوں سے سنا تھا۔ اس لیے تحصیل علم کا شوق ان کے دامن گیر ہوا۔

چونکہ شیراز میں اطمینان نصیب نہ تھا۔ سعدی نے ترک وطن کا ارادہ کیا شیخ جوزی کے آگے نظامیہ بغداد میں زانوئے ادب تہہ کئے۔ سرگور او سلی نے لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی ہے جس کو اٹھارہ مختلف ملکوں کی زبانوں میں لکھا گیا ہے۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے نامہ ایست معرفت کردگار

جمہور انسانی کو پیڑیا میں لکھا ہے کہ سعدی کے کلام کی بلاغت اور بذلہ سنجی روما کے مشہور شاعر ہورلیس کے کلام سے بہت ملتی ہے چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی تھی۔ اس لئے حسن ظن غالب ہے کہ وہ ہورلیس کے کلام سے متاثر ہوئے ہونگے۔ بعض وجہ سے شکسیر سے شیخ کو تشبہ دی جاسکتی ہے۔ مثلاً دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت و شوخی کی چاشنی پائی جاتی ہے دونوں کا بیان ہمیشہ صاف سادہ اور دلنشین ہوتا ہے۔ اور دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت و پسند پر رکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ شیخ کھلم کھلا نصیحت کرتے ہیں۔ جس طرح شکسیر کے صدمہ احوال انگریزی میں ضرب المثل ہیں اسی طرح سعدی کی گلستان کے بھی صدمہ فقرے فارسی اور اردو زبان میں ضرب المثل ہیں۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جمہور کے دلوں پر کس قدر اثر کیا تھا۔ ایشیا میں جس قدر گلستان اور بوستان کی تعلیم کا چرچا ہے اور کسی کتاب کا نہیں۔

گلستان اور بوستان کو شیخ کے کلام کا لب لباب سمجھنا چاہیے۔ لاکھوں استادوں نے اسے پڑھایا اور چھ سو برس سے اس کی تعلیم ایران، ترکستان، تاتار، افغانستان اور ہندوستان میں جاری ہے۔ مغرب کی اکثر زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ علما نے ان کی عزت کی بادشاہوں نے اس کو سلطنت کا دستور العمل بنایا۔ منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکایا۔ سرگور او سلی لکھتا ہے کہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ جو مشہور فاضل جینس نے لاطینی میں کیا تھا اس نے مدتوں یورپ کے اہل علم و ادب کو شیخ کے خیالات پر فریفتہ رکھا۔ گلستان کی قدر و منزلت ہر طبقہ اور درجہ کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی۔ گلستان کے ابواب کی عمدہ ترتیب۔ اس کے فقرہ کی بر جستگی۔ اس کے الفاظ کی شستگی اس کے استعارات کی جرأت اس کی تشبیہات و تشبیہات کی طرح اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ اس کی تصنیف پر صرف کیا۔ گلستان کے دیباچہ میں خود

سعدی نے لکھا ہے کہ

”میں نے عمر کا ایک بڑا حصہ اس پر صرف کیا ہے۔“ اور اسی میں لکھتے ہیں کہ جس فصل بہار کے آغاز میں اس کا لکھنا شروع ہوا تھا۔ وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہو گئی۔“ شیخ نے جس فصل بہار کا ذکر کیا ہے۔ غالباً اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ نے گلستان کے لیے جو سرمایہ جمع کیا تھا وہ پہلے سے اس کے پاس نامرتب تھا۔ جب وہ وطن پہنچا تو دو دستوں کی تحریک پر اس کی ترتیب فصل بہار کے آغاز سے شروع ہوئی اور اس کے ختم ہونے سے پہلے ختم ہوئی۔

ان دونوں کتابوں گلستان و بوستان میں مبالغہ بہت کم ہے اور جہاں ہے وہاں نہایت باعزائم اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں۔ مافوق العادات باتیں اور عجیب و غریب قصے بھی جس سے قدیم اور متوسط زمانے کا مغربی و مشرقی ادب بھرا ہوا ہے ان کتابوں میں کم ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں یہ بات تعجب انگیز ہے کہ باوجود یہ کہ صنائع لفظی اور معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں اور تقریباً گلستان کا نصف حصہ مسجع و مقفی ہے۔ باسنہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہے۔ اور یہ سعدی کے کمال انشا پرداز کی بہت بڑی دلیل ہے۔

وہ اکثر نہایت پاکیزہ و لطیف نکتے جن سے انسانی ذہن خالی ہوتے ہیں۔ ایسی معمولی اور سرسری باتوں سے نکال لیتے ہیں جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں۔

نیچر کے بیان میں سعدی کا کلام واقعی لاثانی ہے۔ وہ اکثر قانون قدرت سے اشیاء کے حسن و قبح اور اصول اخلاق کے ثبوت پر استدلال کرتا ہے۔ اور یہ زیادہ دلنشیں اور عام فہم ہوتا ہے۔ وہ اکثر آزانہ اور محققانہ نصیحتیں کرتا ہے۔ جس کو زاہد و رند دونوں پسند کرتے ہیں۔

گلستان اور بوستان میں شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات لکھے ہیں اور ان سے نتائج استخراج کئے ہیں اس لئے اس کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اور ناظرین کو زیادہ پسند آتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ شیخ جیسا جادو بیان ان کو بیان کرتا ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے بیان کی طرف لوگوں کے دل کھینچتے ہیں اس کے کلام میں ایسا مزہ ہوتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے

آتی ہے اور نہایت رغبت و شوق سے کھائی جاتی ہے۔

غزلیات :- سب میں پہلے غالباً شیخ ہی کا دیوان موجودہ طرز پر مدون کیا گیا ہے۔ ان کے چار دیوان ہیں۔ جن میں سب سے بڑا دیوان موسوم بہ ”طببات“ ہے۔ شیخ کے دیوان کو اکثر تذکرہ نویسوں نے ”مکمل ان شعرا“ لکھا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے انوری و قافانی کی غزلیات موجود تھیں ان کے دیوان میں چند چیزیں ایسی ملتی ہیں۔ جو قدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں ہیں یا بہت کم پائی جاتی ہیں۔ یہی وہ خصوصیتیں ہیں جو غزل کو نہایت باعزائے اور لطف انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام بناتی ہیں۔

شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتے ہیں جو تغزل اور تفتش کے واسطے بہت مناسب رہتی ہے۔ اسی لئے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی محفلوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی ابن احمد جامع کلیات شیخ جس نے شیخ سے بیالیس برس بعد اس کا کلام جمع کیا، اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی۔

نظر خدائے بیناں ز سر ہوا نباشد

سفر نیاز مند آں زرہ خطا نباشد

اس غزل کو سن کر مجلس کے خاص و عام جا بجا بے ہوش اور خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے برخواست ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدت عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا۔

شیخ کی غزل کو جمیلی عشق و محبت نے جو اس کی بات بات سے ٹپکتی ہے اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق و صل و جدائی۔ یاس و امید۔ صبر و مجبوری وعدہ و انتظار اور دیگر لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے ان میں بالکل تصنع نہیں پایا جاتا اور یہ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو اس عالم میں ہر شخص پر گذرتی ہیں۔ اسی واسطے عشاق کے دل پر اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

مقدار یار ہم نفس جوں من مداند یچ کس

ماہی کہ در خشک اوقبت قیمت بداند آب را

اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقعہ ہے اور وہاں جو حالت اس نے آنکھوں سے دیکھی ہے یا کیفیت اس کے دل پر گزری ہے بیان کرتا ہے۔

اے سارہاں آہستہ رآں کا رام جاں در محل است

اشتراں را بار بر پشت ست وما را بردل است

وہ اکثر حالات و واردات کو جو اس کے دل پر گذرتے ہیں تمثیلات میں بیان کر کے کلام کو نہایت بلیغ اور بلند کر دیتا ہے۔ شیخ کے کلام میں باوجود کمال سادگی اور صفائی کے اکثر ایک نزاکت اور چوچلا پایا جاتا ہے۔ جس سے قدام کی غزل معرا ہے۔ وہ ایک سیدھی سی بات کو ہیر پھیر کر کے ایسے خوش نما انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے وہ سنگمزدوں کو ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوش نما اور گراں بہا بنا دیتا ہے

خلق را بیدار باید بود زاب چشم من

وین عجب کان وقت میگیریم کہ کس بیدار نیست

سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدام کی غزل میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کے سبب سے اس کے دیوان کو نمکدان شعرا کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا مدار زیادہ تر مضامین مندرجہ ذیل پر ہے۔

تصوف اور درویشی:۔ عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرانے میں ادا کرنا۔ شاہد مطلق کے شیون و صفات کو زلف و خال و خط و لب و داندن وغیرہ سے تعبیر کرنا کاملین عرفا اور مشائخ پر رند و بادہ خوار، میفروش وغیرہ کے الفاظ کا اطلاق کرنا اور ان کے حالات و واردات کو شراب و نغمہ و دف و چنگ وغیرہ کے لباس میں ظاہر کرنا۔ سلوک و فقیری کے مدارج مقامات یعنی صبر و رضا و تسلیم و توکل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا۔ محتسب اور زاہد و فقیہ محل ادب ہیں طعن و تعریفیں کرنا اور غیر متشرع اور آزاد لوگ جو از روئے مذہب قابل توہین و مذمت ہیں ان کی خوبی ظاہر کرنا۔ دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتنا۔ ناصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنا عقل و دانش کی جابجا توہین اور عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر اس کی

تعریف کر ماساتی و مطرب کو بار بار پکارنا اور ان سے شراب و نغمہ کا اس لئے طلبگار ہونا کہ دنیا کے تعلقات سے انقطاع میں آئے۔ باد صبا کو اپنا پیغامبر ٹھہرا کر ان سے اپنی آرزویں، مرادیں اور حسرتیں بیان کرنا۔

ای صبح نسیم گر بار اتفاقی افتد
آفریں گوئی برآں حضرت کہ مارا بار نیست
اور کبھی سحری کہتے ہیں کہ اگر میرادل تیرے عشق میں دیوانہ ہو گیا ہے تو عیب مت
سمجھو کیونکہ چاند بے نقصان اور زر بی عیب و گل بی خار نہیں رہتا۔

گر دلم در عشق تو دیوانہ شد عیش مکن
بدر بی نقصان و زر بی عیب و گل بی خار نیست
سحری بہار کے موسم سے متعلق کہتے ہیں۔ کہ یہ توبہ شکن ہے ملاحظہ کیجئے

درخت غنچہ بر آورد و بلبلان مستند
جہاں جواں شد و یاران بعیش بنشستند
کساں کے در رمضان چنگ و نی شکستندی
نسیم گل بشنیدند و توبہ بشکستند
بساط سبزہ لکد کوب شد بہ پای نشاط
ز بس کہ عارف و عالم بہ رقص بر جستند

اور کبھی کہتے ہیں کہ عشق میں بلاؤں سے پرہیز نہیں کر سکتے جو عاشق ہوتے ہیں وہ
گرفتار جو رہتے ہیں اس سے نہیں ڈرتے

نہ شرط عشق بود کز بلا پرہیزند
گرفتگان ارادت بجور نگرند

اور بھی کہتے ہیں

اگر ہلاکت سعدی بہ تیغِ فرقت تست
 حلال باشد خونی کہ دوستاں ہمزد
 کبھی کہتے ہیں تیرے چمکے پڑے رہنے میں ہمارا قصور نہیں ہے اپنے غمزہ سے کہو کہ
 آدمیوں کے دل کو نہ بھولیں۔

دنبال تو بودن گنہ از جانب مانیت
 باغمزہ بگو تادل مردم نہ ستاند
 کبھی محبوب کے ہجر کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں کہ اس کی دوری میری ہڈیوں میں نیش
 زنی کر رہی ہے۔

من ماندہ ام مہجور از او پچارہ در بخور ازاد
 گوی کہ نیشی دوراز او بر استخوانم میرود
 اپنے محبوب کی تعریف ایک غزل میں مسلسل اس طرح کی ہے اس کے ابرو کو محرابوں
 سے اس کے دہن کو انگبین سے تشبیہ دی ہے۔ اور کبھی کہتا ہے کہ میں اس کو سرو کہنا چاہتا تھا
 لیکن سرو میں رفتار نہیں ہے اور ماہ سے تشبیہ دینا چاہتا تھا ماہ بات نہیں کرتا۔
 سرو را مانی و لیکن سرو را رفتار نیست
 ماہ را مانی و لیکن ماہ را گفتا نیست
 کبھی محبوب کی معرفت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ سالہا میں اس کی تلاش میں رہا
 حالانکہ وہ خود میرے گھر میں ہے۔

سالہا در پی مقصود بجان گردیدیم
 دوست در خانہ و ما گرد جہاں گردیدیم
 سعدی عشق و محبت کے پوشیدہ اسرار اور عمیق کیفیات اور اندرونی حالات بیان کرتا
 ہے جو دلسببگی کے زمانے میں ہر انسان پر گذرتے ہیں۔ جن کو ہر شخص بیان نہیں کر سکتا۔ بلکہ
 یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گذری ہے مثلاً وصل کی امید میں ہجر بسر کرنا اتنا مشکل نہیں
 ہے جتنا تصور کیا جاتا ہے۔

اے کہ گفتی پہ مشکل جز فراق یار نیست
 گر امید وصل باشد پھیں دشوار نیست
 کبھی کہتے ہیں کہ عشاق کی میں نے عیب جوئی کی تھی اور اس کے نتیجہ میں خود بھی
 عاشق ہوا لیکن اس جرم کے لیے یہ سزا بہت ہے۔

بی دلاں را عیب کردم لا جرم بیدل شدم
 آن گنہ را این عقوبت پھیاں دشوار نیست
 بعض وقت سعدی تصور اور عرفان کے باریک نکاتوں کو بھی بیان کرتے ہیں کہتے ہیں
 ہر چیز کی ایک وقت رنگ اور شان ہے تو ترک صفت کر دے تاکہ تجھ میں من و تو کا فرق باقی
 نہ رہے۔

ہر کس صفتی دارد درنگی و نشانی
 تو ترک صفت کن کہ ازیں بہ صفتی نیست
 کبھی کہتے ہیں کہ سنگ و گیاء کہ اپنے اندر خاصیت رکھتے ہیں وہ اس آدمی سے بہتر ہے جو
 کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔

سنگی و گیا ہی کہ در آن خاصیتی صفت
 از آدمی بہ کہ در او منفعتی نیست
 اور کبھی راضی بہ رضا رہنے کی تعلیم دیتے ہیں۔

آن دوست نباشد کہ شکست کند از دوست
 بر خون کہ دلارام بمزد دیتی نیست
 اور پھر کہتے ہیں۔

میر تلخ ست ولیکن چکنم گر نکم
 چوں گریز از لب شیرین شکر بار تو نیست
 سعدی کے کلام میں آزادی کی تعلیم ملتی ہے وہ بادشاہ وقت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

خرمین پر از بہر لشکر بود
 نہ از بہر آئین و زیور بود
 چو دشمن خر روستائی برد
 ملک باج دہ یک چرای خورد

یعنی خرمنے لشکر کے لئے ہیں شان و شوکت اور آرائش کے لئے نہیں۔ جب چور
 و ہقانوں کا جانور چرالے جاتا ہے تو بادشاہ خراج کیوں لیتا ہے۔
 آرام طلب بادشاہوں کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

تو کے شنوی نالہ داد خواہ
 بہ کیوان برت مکہ خواب گاہ

تم مظلوموں کی فریاد کیا سنو گے، تمہاری خواب گاہ کی چھت آسمانوں سے ٹکراتی ہے۔
 اور کبھی بے غرضی اور آزادی کے اثر میں اکثر کہتے ہیں۔

دلیر آمدی سعدیا در سخن
 چو تیغ بدست است فتنی بہن
 بگو انچہ دانی کہ گفتند بہ
 نہ رشوت ستانی و نہ عشوہ دہ

ای سعدی تو بولنے میں دلیر ہے جب تیرے پاس تیغ زبان ہے تو ملک فتح کر جو کچھ جانتا
 ہے کہ تو نہ رشوت خوار ہے نہ سخن ساز۔

غرض شیخ سعدی کے کلام میں تم کو زندگی کی تمام اقدار و مسائل کے متعلق اشعار ملتے
 ہیں جو سعدی کی شعری عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔

کس خوبصورتی سے سعدی شب بھراں میں موت کی آرزو کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ
 اگر مجھے شب بھراں میں موت آجائے تو روز قیامت میں دوست کے پہلو میں خیمہ لگا دوں گا۔

گر شب بھراں مرا تاختم آرد اجل
 روز قیامت زنم خیمہ بہ پہلوی دوست

اور کبھی کہتے ہیں کہ میری ہر غزل ایک نامہ ہے نامہ لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے
کیونکہ یہ دوست تک نہیں پہنچتا اگر میری غزل اس تک پہنچ جائے تو اظہار حال ہو جائے گا۔

ہر غزل نامہ ایست صورت حالی در آن
نامہ نوشتن چہ سود چوں نرود بسوی دوست

کبھی کہتے ہیں۔ درویش یعنی مرد خدا مشرق و مغرب میں غریب نہیں ہے جہاں کہیں
بھی وہ جاتا ہے۔ تمام دنیا اس کا وطن ہے۔

آرا کہ جای نیست ہمہ شہر جای اوست
درویش ہر کجا کہ شب آید سرائی اوست

یا

مرد خدا بہ مشرق و مغرب غریب نیست
ہر جا کہ می رود ہمہ ملک خدای اوست

ایسے بے خانماں کو جس کا خدا کے سوا کوئی نہیں ہوتا اس کو گدامت کہو کیونکہ سلطان
بھی اس کے گدا ہوتے ہیں۔

بی خانماں کہ بیچ ندارد بجز خدا
اورا گدا مگوی کہ سلطان گدای اوست

اگر دولت مند لوگ اپنے دوست پر دولت بٹھا دیتے ہیں تو میں اپنی جان اس کے
پیامبر کے قدموں پر بٹھا دیتا ہوں۔

گر زر فدای دوست کنند اہل روزگار
ماسر فدای پای رسالت رسان دوست

کبھی کہتے ہیں کہ غیروں کا میری خلوت میں کوئی بار نہیں ہے جو میرا دوست نہیں ہے
وہ میرے لئے بار ہے۔

درون خلوت ما غیر درنی گنج
برو کہ ہرچہ نہ یار نیست بار نیست

کبھی محبوب کو مخاطب کر کے کہتا ہے گرچہ تو غنی ہے اور میں فقیر ہوں لیکن دوستوں کی دلداری ثواب ہے۔

گرچہ تو غنی و ما فقیریم
دلداری دوستان ثواب است

کبھی کہتے ہیں اگر رقیب بھی ظلم کرتا ہے تو صبر کرتا ہوں کیوں کہ گل کے ساتھ ہمیشہ خار ہوتے ہیں۔

صبر بر جور رقت چہ کنم گر کنم
ہمہ دانند کہ در صحبت بگل خاری است

محبوب ہر روز کل ملنے کا وعدہ کرتا ہے لیکن سعدی کی شب کے لئے کبھی وہ کل نہیں آتی

ہمہ شب می پزد سودا بیوی وعدہ فردا
شب سودائی سعدی را مگر فردا نمی باشد

کبھی کہتے ہیں کہ سعدی کا دل سوز عشق سے ایک آتش کدہ کی مانند ہو گیا ہے جو اس کے اشعار سے ظاہر ہے۔

آتش کدہ است باطن سعدی ز سوز عشق
سوزی کہ در دست در اشعار بنگرید

سعدی اپنے محبوب کے چہرہ کو پر از در عقیق کہتا ہے اور اس کی زلفوں کو مار سے تشبیہ دی ہے جو غزل کی حفاظت کے لئے ہے۔

گنجیت پرز در عقیقین آں پیر
بالائی گنج حلقہ از مار بنگرید

غزل مولانا روم

خدا نے انسان کو جب ہستی کا جامہ پہنایا تو اس میں کچھ گل بوٹے بھی بنا دیئے جس کی بدولت گلشن حیات کی رنگینی جنت نظر بن گئی۔ حسن ازل کی طرف سے جو کچھ انسان کو ملا اس میں ایک دل بھی ہے۔ جس کے ساتھ عشق بھی پیدا کیا گیا اور دل "مقام عشق" ٹھہرا۔ عشق کو لطف عطا کرنا مقصود ہوا تو دل کو زبان عشق یعنی ملکہ شعر نصیب ہوا۔ عالم شعر کے لئے ساری رونق جذبات کی بدولت ہے۔ عشق اس کی جان اور روح رواں ہے۔ جس قدر قوی اور لطیف یہ جذبہ ہوتا ہے اور کوئی جذبہ نہیں۔

عشق می گویم و جان می دہم از لذت وئے

جس طرح عشق کے مظاہر مختلف ہیں اسی طرح مراتب اور مدارج بھی مختلف ہیں۔ جیسے مظاہر حسن غیر محدود ہیں ویسے ہی عشق کے مراتب اور مدارج بھی مختلف ہیں۔ قلب انسانی کبھی حسن فطرت کا شیداء ہوتا ہے اور کبھی دردملت سے بے تاب کوئی کسی سیمیں تن نازنین کے ایک ہی جلوہ سے اس قدر سحر زدہ ہوتا ہے کہ بس سب کچھ اس کی ایک نگاہ لطف پر بچھاوڑ کرنے کو تیار ہوتا ہے لیکن یہ حسن و عشق کی فانی صورتیں ہیں۔ عشق کا محرک حسن ہے حسن جس مرتبہ کا ہو گا کشش عشق بھی اسی درجہ کی ہوگی۔ عشق حقیقی میں ناز اور نیاز دونوں بے نظیر ہیں۔ عشق حقیقی میں دہدہ، جلال اور جذبہ، استقلال و بے خودی اور بے نفسی اور تسلیم و رضا پائی جاتی ہے جو عشق مجازی میں ہیں۔ اور اسی مسلک کا نام تصوف ہے۔

غزل کی بلندی اور ترقی کی تاریخ تصوف کی ترقی سے وابستہ ہے۔ محبوب اور مطلوب کی بلندی کے باعث عشق و محبت کو بھی بلندی حاصل ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب صفا کے کلام میں جس قدر بلندی فکر، جذبات، پاکیزگی خیال صداقت احساس اور اثر اخلاص پایا جاتا ہے وہ کسی اور گروہ کے کلام میں نہیں۔

صوفیانہ شاعری ان الفاظ اور خیالات سے پاک ہوتی ہے جو پاکیزگی اور تہذیب کے خلاف ہوتے ہیں۔ مثلاً بوس و کنار وغیرہ اگرچہ عشق حقیقی کے صداہم مضامین مجاز کے پیرایہ میں ادا کئے جاتے ہیں لیکن صرف اس حد تک کہ بادہ و ساغر کے استعارہ میں مشاہدہ حق کی گفتگو ہو سکے۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

عشقِ شاعری کا کمال عشقی حقیقی پر موقوف ہے اور یہ تصوف کے ساتھ مخصوص ہے ایران میں مولانا روم کا زمانہ صوفیانہ شاعری کے عروج کا زمانہ ہے۔ عشقیہ شاعری کے حسن و کمال میں دنیا کی کوئی زبان فارسی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جو معنوی حسن و بلندی تصوف کی وجہ سے اس کو حاصل ہے۔ شاید ہی دنیا کی کسی اور قوم یا زبان کی شاعری میں ہو اس پر جس قدر فارسی دان ناز کرے بجا ہے۔

تذکرہ نویس متفق ہیں کہ ابتدا میں جن لوگوں نے صنف غزل کو ترقی دی اور اس کے مردہ جسم کو معنی اور اثر کی روح بخشی اور غزل کو غزل بنایا وہ سعدی، عراقی اور مولانا روم ہیں اگرچہ کلام کے صوری محاسن اور لطائف کے اعتبار سے مولانا کی غزلیات سعدی اور عراقی کے ہم پایہ ہیں لیکن مختلف معنوی خصوصیات کے باعث ان کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ جو ان کو فارسی کے دیگر غزل گو صوفی شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

مولانا کی غزلیات مختلف وجوہ کے باعث مولانا کی تصانیف کا تفصیلی و تمثیلی مطالعہ کرنے والے پر حسب ذیل خصوصیات کو منکشف کرتا ہے۔

یہ فارسی کے سب سے بڑے معنوی غزل گو شاعر تھے۔ غزلیات مولانا کے معنوی اور ادبی ارتقا کا پہلا زینہ ہے۔ فارسی غزل میں مولانا کی غزلیات پیغام گوئی کا بہترین نمونہ ہے۔ گرمی عشق بے تاب الفت، اسرار خودی اور رموز بقا کی جس قوت سے پردہ کشائی کی گئی ہے۔ اس کی مثال فارسی شاعری میں سوائے اقبال کے کسی اور کے پاس نہیں ملتی۔ اور اقبال بھی

بادہ رومی سے سرشار ہیں۔ ان کی غزل مسلسل نظم معلوم ہوتی ہے جس میں عشق و محبت اور دیگر احساسات کی تصویر کھینچی گئی ہے جو دل کے حال کو آنکھوں کے آگے نمایاں کر دیتا ہے۔ غزل کی خوش قسمتی ہے کہ شیخ سعدی نے یہ نغمہ کچھ ایسی دلاویزی سے چھیدا کہ ہر زندہ دل اس سے مسحور ہو گیا۔ خسرو اور حسن دہلوی نے تو اسے بولتا جادو بنا دیا۔ جس نے فارسی غزل کو غزل بنایا اس میں مولانا روم کا خاص حصہ ہے۔ اور وہ ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کے کلام کے صرف شعری حصہ پر نظر کی جائے تو ان کی جگہ صف اول کے غزل گو شعرا میں ہوگی۔

مولانا کا کلام سخن عشق ہے اس لیے وہ دلی جذبات کا آئینہ ہے۔ ان کا کلام اور زندگی ہم آہنگ ہیں۔ سوز دل کے متعلق فرماتے ہیں۔

عشق شد مہمان ہر دل سوختہ
جان و دل زر بہر او قربان کنم
اضطراب عشق اور انتظار کے جذبات کی کس قدر کامیاب ترجمانی ہے۔
قراری ندارد دل و جان ما
کناری ندارد بیابان ما
دل عاشق ہر وقت حضور کا ممتنی ہے۔

یک لفظ ز کوئی دوست دوری
در مذهب عاشقان حرام است
عاشق بے تاب کوئی یار میں جکر لگاتا ہے اور اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ کسی دن خود محبوب اس کی گلی میں آجائے۔ اور اس کو چہ دیران کو اپنے قدم سے جنت بنادے۔
مخمور و مست گردان امروز چشم مارا
ریشک بہشت گردان امروز کوئی مارا
اور غالب نے اس مضمون کو یوں باندھا ہے۔

معنی وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون تھا

خانہ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا

باد جو اس کے عاشق بے خود کی تمنا یوں ہے۔

یکدست جام بادہ و یکدست زلف یار

رقص چینیں میاں میدانم آرزوست

مولانا کے کلام کی دوسری خصوصیت حقائق کا بیان ہے۔ انہوں نے بے شمار انفس

و آفاقی حقائق کی ترجمانی فرمائی ہے۔ حقیقت بین نظر کے لیے اس میں رمز شاسی اور رازدانی کا

ایک غیر محدود ذخیرہ ہے۔ اور یہی مولانا کی معنوی خصوصیت اور حقیقی قدر و قیمت ہے۔

عشق و بندگی کے متعلق کہتے ہیں۔

دیگران آزاد سازند بندہ را

عشق بندہ میکند آزاد را

ان کا کلام حقائق کا ایک دریائے بے پایاں ہے۔ مولانا کے کلام میں جوش خیال اور

بیان کی فراوانی ہے اور اسکی نظیر کسی اور غزل گو صوفی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ تخیل کی

برق رفتاری پائی جاتی ہے۔ قلب میں عشق کی گرمی اور جذبات کا طوفان برپا ہے۔

مولانا کے خاص مضامین مثلاً عشق کی اہمیت اس کے ساتھ انسان کی عظمت اور عروج

انسانی کی راہ عقل و عشق کا مقابلہ دل کی تربیت اور اس کے طریقہ وغیرہ ہیں۔

مولانا نے عشق اور اس کے متعلقات اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اس کثرت سے

اشعار لکھے ہیں کہ اگر ان کے دیوان کو "ترانہ عشق" کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ عشق

زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ عشق ہی سے قربانی پیدا ہوتی ہے۔ عارف رومی اپنے عشق کو

ابدیت بخشا چاہتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کا محبوب ابدی ہو۔

عشق زمدہ در روان و در بصیر

ہر دل باشد ز غنجہ تازه تر

عشق آن زندہ گزین کو باقیست

از شراب جانفزایت ساقیت

عشق اور مذہب میں ربط کا یہی محل ہے۔ جب تک مذہب صحیح معنوں میں ہوتا ہے یہ اتحاد قائم رہتا ہے۔ جب ذوق فنا ہو جاتا ہے تو ان دونوں میں افتراق پیدا ہو جاتا ہے۔ مولانا نے عشق پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کے پاس عشق سے مراد ”عشق خدا“ ہے۔

ہرچہ جز عشق خدائے احسن است

گر شکر خوردن بود جان کندن است

عشق جز دولت و ہدایت نیست

جز کشفاد دل و عنایت نیست

وہ کہتے ہیں کہ ”مومن از عشقت و عشق از مومن است“ حقیقت شہاسی کے لیے ایک

عقل کا راستہ ہے، دوسرا لمان کا۔

عشق کے جذبات کی یوں تصویر کشی کی ہے۔

دل پیش رخس چہ رقص می کرد

و از آتش عشق جان چہ می شد

عشق میں غم بہتہ بہتہ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کو اس میں لطف آنے لگتا ہے

اس حال میں اس کی نظر درد و غم پر پڑتی ہے۔ صرف لطف محبت کا ہی خیال رہتا ہے۔ وہ غم کو

مسرت سمجھتا ہے۔ اور آسانی سے برداشت کر لیتا ہے۔

مسئلہ توحید یعنی ایک کے ہو رہنے پر مولانا نے یہ زور دیا ہے۔ اور اس میں جوش اور

غیرت دلانے کا انکا خاص انداز نمایاں ہے۔

مولانا صرف ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے زبان مانوس اور کان آشنا ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیالات میں سادگی ہے اور خیالات اچھے ہوئے ہیں۔

مکانم لا مکاں باشد نشانم بے نشان باشد

نہ تمن باشد نہ جاں باشد کہ من از جاں جانانم

مولانا روم کی مثنوی پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے اس لیے میں نے یہاں ان کی غزل کی چند

خصوصیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

خسرو حسن بحثیت شاعر

خسرو اور حسن سپہر علم کے دو درخشندہ ستارے، محض شاعر تھے۔ نہ صرف یہ شعر و سخن میں باکمال تھے بلکہ ان کی روحانیت بھی مثل آفتاب اجلا کر تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ یہ دونوں آفتاب عالمی نظام الدین اولیاء مرکز روحانیت کی طرف کھینچ کر رہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں ستارے اسی آفتاب کے عکس ہیں اور اسی کافئیں تھا جس نے ان دونوں کو اس طرف متوجہ کیا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ضیاء الدین برنی کی ضیاء پاشیاں اس چیز کو روشن کرتی ہیں کہ یہ دونوں آسمان کے ستارے حضرت نظام الدین اولیاء کی تحلی کدہ پر بے لگیر ہوئے اور ہمیں سے انکی دوستی کی ابتداء ہوئی۔ شیلی نے بھی شعرا انجم میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ فرشتہ نے بھی انکی دوستی کے واقعہ کو بیان کیا ہے لیکن مصنف تاریخ جلالی نے اس کو ایک افسانوی رنگ دیا ہے جس کا حوالہ ہمیں شعرا انجم (جلد دوم شیلی نعمانی) میں ملتا ہے۔

خسرو اور حسن کی دوستی بھی مشہور زمانہ ہے اور ان کے ممدوحین بھی تقریباً ایک ہی ہیں۔ کیوں کہ دونوں ایک ہی دربار سے منسلک رہے ہیں۔

سعدی سے پہلے متقدین غزلیں کہتے ہی نہیں تھے یا اگر کہتے بھی تھے تو ان کی غزلیں روکھی پھٹی اور سیدھی سادی ہوتی تھیں لیکن سعدی نے اس رنگ کو بدلا ایک حد تک جذبات، واردات اور محاطات بیان کر کے غزل کے افسردہ قالب میں ایک نئی روح پھونک دی اور اس کا رتبہ کئی درجہ بلند کر دیا۔ میر حسن اور سعدی کے زمانے میں یہی رنگ زیادہ کامل اور مقبول سمجھا جاتا تھا۔ اور غزل میں ہر شخص اسی کی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ حسن اور خسرو نے بھی اسی رنگ کو اپنایا۔ دونوں کا خیال ملاحظہ ہو۔

خسروا بر مست ندر ساغر معنی بر سخت
شیرہ از فخانہ مستی کہ در شیراز بود
گر بنوشی درد از میخانہ درد اے حسن
درد معنی از مئے سعدی شیرازی دہی



حسن نے تو سعدی کے تتبع کو کمال تک پہنچا دیا تھا لوگ ان کو "سعدی ہند" کہنے لگے تھے۔ ان کے ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی یوں رقم طراز ہیں۔

دویم شاعری از شعرائے یگانہ در عصر علانی امیر حسن سجزی بودہ است
 و اور اتالیقات نظم و مثر بسیار و سلامتی ترکیب و روانی سخن آیت بودہ است و
 از بسکہ غزلہائے وجدانی در غلّت روانی بسیار گفتہ است اورا "سعدی"
 ہندوستان خطاب شدہ بود۔ غزلیات جگر سوز اور از حتماً دلہائے عاشقاں
 آتش محبت پیروں میں آرد و اشعار دل پذیر اور سچے بدلہائے مخمور اس می
 سازند و لطائف روح افزائے اورا مایہ اہل ذوق است، و سخن این بزرگ
 چاشنی شیخ سعدی دارد۔ (مقدمہ دیوان حسن سجزی)

حسن کے پاس غزلیں ہیں لیکن ان میں صرف چند ہی غزلیں پائے کی کھچی جاتی ہیں۔
 مولانا شبلی نے ان کی غزلوں کے متعلق یوں اظہار رائے فرمایا ہے۔

صف غزل پر ان کا خاص احسان ہے جو سوز و گداز جذبہ اثران کے
 کلام میں موجود ہے وہ ان کے کشتہ محبت امیر خسرو میں بھی نہیں۔ (شعرالجم
 جلد دوم) سوز و گداز ملاحظہ ہو۔

خبرو کہتے ہیں کہ موسم گل آگیا ہے اور تمام بلبل باغ کی طرف جا رہے ہیں
 لیکن جو مرغ ترے جبر میں گرفتار ہے اسکو آشیاں کی ہوس نہیں ہے

گل آمد و بیاب رسیدند بلبلان

و آن مرغ رفتہ را ہوس آشیاں نبود

کبھی کہتے ہیں کہ خسرو اگر تیرا گل یعنی تیرا محبوب گزار سے چلا جائے

تو مت رو کیونکہ ہر جن کے لیے غراں ضروری ہے۔

خسرو اگر گل تو ز گزار شد مثال

دانی کہ بچگاہ گل بے غراں نبود

اس شعر میں بے ثباتی دنیا کی طرف بھی اشارہ ہے۔ حسن کا خیال ملاحظہ ہو کہتے ہیں کہ

اس سال رونق گل کچھ اچھی نہیں ہے کیوں کہ باغ میں میرا سرو خراماں ہی نہیں ہے۔
 اما رونق گل تر آنچناں نبود
 بے سرو گل بدیہ و بلبل رواں نہ بود
 این کارواں گل پس سالے رسید لیک
 ماہے کہ دردست دریں کارواں نہ بود
 علامہ شبلی غزل خسرو کے بیان میں یوں رقمطراز ہیں۔

”اس وسیع مرقعہ میں صرف امیر موصوف (خسرو) کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔
 ان کے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں کہ
 وہ بھی امیر ہی کا فیض ہے۔“ غزل کے میدان میں بعض مقامات پر حسن خسرو سے دو
 قدم آگے ہیں لیکن قصائد اور شثنوی اور دوسرے اصناف سخن میں وہ امیر خسرو کو نہیں پہنچ سکتے
 جس کا اقرار خود انہوں نے کیا ہے۔

خسرو از رہ کرم و منڈیر
 آنچہ من بندہ حسن می گویم
 خنم چون سخن خسرو نیست
 سخن این است کہ من می گویم
 خسرو نے حسن کی خوبیوں کا اس طرح اعتراف کیا ہے
 خسرو عشق تو اسرار حدیث است مگر
 کز سخن ہائے توام بوی حسن می آید
 جامی نے بہارستان میں حسن کے کلام پریوں اظہار رائے کیا ہے۔

خواجہ حسن را در غزل طرز خاص است اکثر کافیہ ہائے تنگ و ردیف ہائے
 غریب می نمودند لاجرم از اجتماع آنها شعروے اگرچہ در بلادی الراے آسان
 می نماید اما در گفتن دشوار است بناء بر این اشعار وے را سهل ممتنع گفته اند
 صاحب تارتخ فیروزی شاہی یوں رقم طراز ہیں۔

”من در لطافت و سلاست عقل و تہذیب اخلاق مثل خواجہ حسن ندیدہ ام“

باوجود ان تمام خوبیوں کے حسن کم گو شاعر ہیں جس کا انہیں خود اعتراف ہے۔

رسم حسن ہمیشہ چوکم گفتن آمدہ است

زین بیشتر مجال نداد این قصیدہ را

۶۳ سال کی عمر تک انہوں نے جو کچھ لکھا اور قابل اشاعت سمجھا وہ دس ہزار ابیات ہیں

جو اودھ کے شاہی کتب خانہ کے نسخہ میں غزلوں کے ۵۳۳ اور قصائد کے ۴۹ اور رباعیات کے

۲۰۰۰ جملہ ۱۶۰۲۷ ابیات بتائے گئے ہیں۔ شکیل احمد صاحب جو حسن پر ریسرچ کر رہے ہیں لکھتے

ہیں کہ حسن کے ایک اور دیوان کا ذکر ملا ہے لیکن وہ دیوان ابھی تک لاپتہ ہے اس کا کوئی

سراغ نہ مل سکا۔

اس کے برخلاف خسرو نہایت پرگو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے ہر صنف سخن

میں طبع آزمائی کی ہے۔ خسرو نے بہارستان جامی کے مطابق چار لاکھ سے زیادہ اور پانچ لاکھ سے

کم اشعار کہے۔ فردوسی باوجود قادر الکلام شاعر ہونے کے ستر ہزار سے زیادہ اشعار نہ لکھ سکا۔

فردوسی صرف شنوی کا استاد ہے۔ سعدی غزل کے بادشاہ ہیں کمال اسمعیل۔ خاقانی اور انوری

ظہیر اور عرفی قصیدے لکھتے ہیں لیکن خسرو ہی وہ تہا شاعر ہے جس نے تمام اصناف سخن میں

طبع آزمائی کی اور اس کی قادر الکلامی کی انتہا یہ ہے کہ اس نے عذرا الکمال اور مطلع الانوار صرف

پندرہ پندرہ دن میں لکھیں۔

حسن کے کلام میں خسرو کی طرح روانی تو ہے لیکن غنایت نہیں ملاحظہ ہو۔ خسرو

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا

چوں میکشم دل بچنین روز زد لدار جدا

حسن:-

ساقیا مے دہ کہ می خاست از خاور سفید

سرو را سر سبز شد صد برگ را چادر سفید

حسن اور خسرو دونوں کی مشترک خصوصیت ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے

ہیں جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے حسن کی تو زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحر میں ہی ہیں۔ چھوٹی بحر کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا لہجہ نرم ہے اور جذبہ میں گداز ہے۔ خسرو کے کلام میں سوز بہت ہے۔

خسرو کہتے ہیں کہ اے نادان طیب میرے سر بالیں سے ہٹ جا کیوں کہ میں درد بحر میں مبتلا ہوں اور میرا علاج سوائے دیدار دوست کے نہیں ہے۔

از سر بالیں من برخیز اے نادان طیب

درد مند عشق را دارو بجز دیدار نیست

حسن اسی مضمون کو یوں بیان کرتے ہیں کہ طیب کو میرے درد بحر کا علم نہیں ہے وہ جو دو ابتلائے گادہ میرے لئے سود مند نہیں ہو سکتی۔

طیب علم ندارد ز درد فرقت عشق

چہ سود مند بود شربت کہ او فرمود

خسرو نے مختلف صنف سخن میں الگ الگ شعراء کا تتبع کیا ہے۔ غزل میں سعدی۔ مثنوی میں نظامی مواعظ و حکم سنائی خاقانی۔ قصائد میں رضی الدین نیشاپوری و کمال اسماعیل۔ حسن نے بھی غزل میں سعدی کا پورا پورا تتبع کیا ہے اور اس میں بہت کامیاب رہے۔ خسرو کا رنگ جدا گانہ ہے۔ قصائد میں خاقانی کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں خسرو کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن حسن ان کی پیروی نہ کر سکے۔ مثنوی بھی لکھی ہے لیکن نظامی کا تتبع نہ کر سکے۔ لیکن خسرو کے خمسہ کے جواب میں اوروں کے مقابلہ میں بہت حد تک پورے اترتے ہیں۔

خسرو اور حسن دونوں کے پاس رعایت لفظی بہت ہے جو سبک ہندی کا طرز ہے۔ اس کو مراعات النظر بھی کہا جاتا ہے۔

شاخ و برگ و محبت و محنت

ہر دو از یک نہال می گیرند

یہاں پر حسن نے شاخ و برگ کی رعایت سے نہال استعمال کیا ہے۔ ایسی کئی مثالیں

مل سکتی ہیں۔

حسن اور خسرو دونوں کے پاس وصف نگاری اور مضمون آفرینی موجود ہے۔ حسن کی وصف نگاری ملاحظہ ہو۔

جاں کز زلف مشکیں دام کردند

جہاں زیر ہر مو رام کردند

اور ایک جگہ زلف کا وصف بیان کیا ہے۔

بندے اگر کشاید از زلف ظالم او

از ہر خمی برآید فریاد داد خواہی

میں نے کہا ہے کہ اگر اس کے ظالم زلفوں کے بند اگر کھولے جائیں تو ہر ایک خم سے داد خواہوں کی فریاد نکلے گی یعنی میرے محبوب کی زلفوں کا یہ حال ہے کہ اس کے بند میں چلنے والوں کے دل اسیر ہیں جب یہ بند کھولے جائیں گے تو یہ سب فریاد شروع کر دیں گے۔

خسرو نے بھی اپنے محبوب کی زلف کا وصف اسی طرح بیان کیا ہے۔

جان زبند کالبد آزاد گشت

دل بگیوئے تو زندانی ہنوز

کہتے ہیں کہ جسم کی قید سے روح تو آزاد ہو گئی۔ لیکن دل ابھی تیرے زلفوں کی قید میں اسیر ہے۔ حسن اپنے محبوب کا وصف یوں بیان کرتے ہیں۔

سمن ساقی و سوسن بوے دلالہ روی و نسرین بر

تعالیٰ اللہ اگر انصافست گزار این چہیں باید

کہتے ہیں کہ میرا محبوب سمن کی طرح ہے اور اس کے جسم سے سوسن کی بو آتی ہے اس کا چہرہ لالہ کی طرح روشن ہے اور اس کی آغوش نسرین کی طرح صبح ہے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو خود میرا محبوب ایک گزار ہے تجھے باغ میں جانے کی بھی حاجت نہیں۔ خسرو اپنے محبوب کا وصف اس طرح بیان کرتے ہیں۔

پری پیکر نگارے ، سرو قدے ، لالہ رخسارے

سراپا آفت دل بود شب جائے کہ من بودم

اس شعر میں حسن سے زیادہ خسرو کے پاس بر جستگی ہے۔ خسرو کہتے ہیں کہ میرا محبوب پری پیکر ہے۔ اس کا قد مانند سرو ہے اور رخسار مانند لالہ اسی لئے میں گلستان سمجھ کر اس کے سائے میں شب بسر کر رہا تھا اور میرے دل کے لئے ایک آفت بنا ہوا تھا۔

تشبیہ شاعری کے چہرے کا غازہ ہے۔ لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت بنادی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدما کے قلم سے نکل گئیں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بے کار تھیں۔ امیر خسرو اور حسن نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں۔

قدما پہلے محبوب کی چال کو کبک سے تشبیہ دیتے تھے خسرو نے کبوتر سے سب میں پہلے تشبیہ دی۔

زہی خرامش آں نازنین بہ عیاری

کبوتری بہ نشاط آمدست پنداری

حسن اور خسرو نے شطرنج کی بہت سی اصطلاحوں کو استعمال کیا ہے۔ خسرو

شطرنج عشق باز کہ ما بہر پر تو

خود را بمانگاہ رسانیم و شد گنم

تخت شاہیت کہ بر فیل نہد فرزین بند

رخ درین عرصہ منہ بیدق ایں شاہ نہ

حسن

نزد عشقت پاک می بازم ولے ترسم از انک

کعبتیں چشم غلطانی مرا بازی دی

چشم شوخ تو کہ در عین دغا اندازی

مہرہ بمعیدہ ازیں سوختہ اندازی

غزل کی ترقی کا نور و زلف ادا، اور جدت اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں

لیکن پھر بھی وہ نقش اولین تھا۔ خسرو اور حسن کی بوقلموں طبعیت نے جدت اسلوب کے سینکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دیئے جو اگلوں کے خواب و خیال میں نہ آئے تھے۔ ایک غزل بھی امیر خسرو کی ایسی نہیں ملتی جس میں کوئی نئی تشبیہ نہ ہو۔

حسن کے پاس بھی اکثر نئی تشبیہیں ملتی ہیں لیکن حسن ہر غزل کے کسی نہ کسی مصرعہ میں کوئی بات ایسی کہہ دیتے ہیں جو ایک جھٹکا ہوا اثر رکھتی ہے۔

غلام زرگس مسمم کہ با مداد و پلگاہ

قدح بدست گرفتہ ز خواب برخیزد

زرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اس کو جام زر سے تشبیہ دیتے ہیں اور تشبیہ عام تھی لیکن اس اسلوب بیان میں زرگس نے خواب میں دیکھا کہ اس کو جام زر ہاتھ آگیا ہے ایک خاص لطف پیدا کر دیتا ہے کیونکہ زرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں اسی لئے خواب دیکھنے کی توجیہ وقفیت رکھتی ہے۔ خسرو کہتے ہیں۔

میروی و گریہ باز آید مرا

ساعتہ بنشین کہ باراں بگذرد

یہ بھی انوکھا خیال ہے کہ جب تو جانے لگتا ہے تو مجھے جدائی کے غم سے رونا آتا ہے تو کچھ دیر بیٹھ جاتا کہ بارش تھم جائے یعنی تو جانے کا خیال ہی مت کر کیوں کہ تو جب بھی جانے لگے گا مجھے رونا آجائے گا۔

معشوق کی گراں قدری کو خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

حسن کا خیال ملاحظہ ہو

ما عشق ترا بجاں خریدیم

اینست ز عمر حاصل ما

چشم محبوب کو سب مخمور اور مئے آلود باندھتے ہیں۔ خسرو کہتے ہیں مجھے شراب کی

ضرورت ہی نہیں جس وقت تیری آنکھوں میں خمار رہے میں تیری مخمور آنکھوں سے ہی مستی پالیتا ہوں۔

مے حاجت نیست مستیم را
در چشم تو تا خمار باشد

حسن نے محبوب کی آنکھوں کا وصف یوں بیان کیا ہے۔

چشم او در جادوئی شاگرد کیست
کانچہ او کرد اوستادی ہم نکرد

نہیں معلوم آپ کی آنکھیں جادوگری میں کس کی شاگرد ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جتنا اچھا جادو کر سکتی ہیں ان کا استاد بھی نہ کرے گا۔ چشم محبوب گویا ایک ساحر ہے۔

لطف وقہر کی نگاہ کا فرق ملاحظہ ہو

کہتے ہیں کہ کس طرح مارتے ہیں اور جلاتے ہیں تو وہ ان کی نگاہ کا کرشمہ ہے کہ ایک نظر سے تو مارتے ہیں اور دوسری ہی نگاہ میں زندہ کر دیتے ہیں یعنی نگاہ لطف زندہ کرتی ہے اور نگاہ قہر مار ڈالتی ہے۔

حسن اپنے محبوب کے خال و چشم کے بارے میں لکھتے ہیں

پیوستہ بہ دنبالہ چشمت رود آں خال
ہندو بچہ ترک کماندار بازی

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو یوں ادا کیا ہے۔

بت بوقت تقویٰ و آخر این نمی دانی

کہ در شہر مسلمانان نباید این چہیں آمد

پھر کہتے ہیں کہ تاریک شب تھی اور میرا چہناتلخ ہو گیا تھا کہ ناگاہ ایک شمع شکر بار کی آمد ہوئی جس سے زندگی مل گئی۔

تاریک شبی داشتم و تلخ حیاتی
ناگاہ یکی شمع شکر بار در آمد

اسی خیال کو جگر نے یوں پیش کیا ہے

خیال یار سلامت تجھے خدا رکھے

ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

خسرو نے معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کیا ہے

جان ز نظارہ خراب و ناز اد اندازہ بیش

ما بہ بوی مست و مساقی پردہد پیمانہ را

حسن نے کس لطف سے اسی خیال کو پیش کیا ہے

اے حسن دست تو در فتر اک دلش کے رسد

ایں طرف فقر قوی آن سو غنای باکمال

یعنی اے حسن تیرا ہاتھ وصل کی فتر اک میں کس طرح پہنچے گا تو تو فقر کی عادت رکھتا ہے

لیکن تیرا محبوب غنی ہے۔ اکثر جگہ صرف ایک دو لفظوں کے الٹ پھیر سے عجیب لطیف بات پیدا

کر دیتے ہیں۔ خسرو۔

چشم بد دور از چہاں روی

کہ از و چشم دور نتوان کرد

یعنی ایسے چہرے سے چشم بد دور رہے جس پر سے نظر ہٹتی ہی نہیں یعنی خوبصورت محبوب کو نظر

نہ لگے۔ حسن

اور اکہ از سودات زیاں دیدم گفت

کار سودات گہی سود بود گاہ زیاں

اس شعر میں سودا کے ایک جگہ معنی خیال کے ہیں اور دوسری جگہ کار و بار عشق میں جو

حالات پیش آتے ہیں ان کے بیان کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں۔ اہل لکھنؤ نے اس کا نام

معاملہ بندی رکھا ہے۔ بہر حال اس طرز کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں۔

خسرو کی معاملہ بندی ملاحظہ ہو۔

شہا بردز آمد بسی کنز دل نہادی یاد را
جانم ز تن آمد برون بوی نہ دادی باد را

دی سوی سرو لاله رخ پیغام دادم باد را
بنوشته خط بندگی آن سوسن آزاد را

عموماً شعراء اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہے جس کا نام علمی زبان ہے۔ خصوصاً غزل کی زبان روز مرہ اور عام بول چال کی ہونی چاہیے کیوں کہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اس کا خیال رکھا ہے اور حسن کے پاس بھی یہ پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس کا ایک بڑا مرتبہ ہی ہے۔

خسرو محبوب سے کہتے ہیں تم نے بہت سے دل لیے ہیں خوب غور کر کے دیکھو جو بہت زخمی ہے وہی میرا دل ہے۔

دل بسی بردہ نکو بشناس

آن کہ مجروح تر از آن من است

حسن کہتے ہیں کعبہ جا کر دعا کرنے کے لیے کہا جاتا ہے میرا تو کعبہ بھی تو ہی ہے اور مقصود بھی تو ہی ہے۔

گفتی کہ بہ کعبہ رو دعا کن
خود کعبہ ماتونی دعایم

خسرو اور حسن نے روزمرہ اور محاورہ کو بھی استعمال کیا ہے۔

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم
کہ از ابروے تو چشم بدو محراب افتاد

میرا چہرہ دیکھ کر مجھ کو قبلہ کا دھوکا پڑتا ہے کیوں کہ مجھ کو تیرے ابرو سے دو محرابیں نظر

آتی ہیں۔

امیر خسرو نے ایسے بھی کئی محاورے باندھے ہیں جو ان کے سوا کسی اور قادر الکلام شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ مثلاً ”از گرہ اوچہ می رود“ ”آواز کردن“ ”گفتار میگویم“، مالا کلام کردن کسی کو ساکت و بند کرنا وغیرہ۔

غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے۔ قصائد کا موضوع مدح ہے۔ شنویوں، قصے یا اخلاق کے لیے مخصوص نہیں۔ قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں۔ جذبات نگاری کے لئے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ قدما بلکہ متاخرین میں بھی اس کا کم رواج ہے۔ امیر خسرو اور حسن نے البتہ مسلسل غزلیں لکھی ہیں خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ بہار میں کیا کیا لوازمات ہو اس کی تفصیل اس غزل میں ملتی ہے۔

ہنگام گل است بادہ باید
ساقی و حریف سادہ باید

خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے۔ غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنا امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ حسن نے بھی بعض نئے مضامین باندھے ہیں اور ان دونوں کے کلام میں قدما کے مقابلہ میں ایک انوکھا پن اور شکستگی پائی جاتی ہے۔

زہی عمر دراز عاشقان گر
شب بھراں حساب عمر گیرند

یعنی اگر شب بھر کو بھی عاشقوں کی عمر میں شامل کر دیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے۔

خسرو کے صنائع بہت بے تکلف ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں۔ صنعت طباق میں اعداد ان کی خاص چیز ہے۔

درد ہا داری ودرمانی ہنوز
 حسن اور خسرو دونوں کے پاس تصوف ہے لیکن عشق حقیقی کو بصورت مجاز بیان کیا گیا ہے۔
 گر اے زاهد دعائی خیرمی گوی مرا این گو
 کہ این آوارہ کوی بتاں آوارہ ترا بادا
 دنیا کی بے ثباتی کو خسرو نے اس طرح بیان کیا ہے۔

یاراں کہ بودہ اند ندانم کجا شدند
 یا رب چہ روز بود کہ ازما جدا شدند
 گونو بہار آمد و پرسد ز دوستان
 گو اے صبا کہ آن ہمہ گل ہا گہا شدند
 کہتے ہیں کہ جو میرے دوست تھے وہ سب نہ جانے کہاں چھپ گئے معلوم نہیں کس
 منحوس دن وہ مجھ سے جدا ہوئے تھے کہ آج تک مل نہ سکے۔ نو بہار آکر دوستوں سے پوچھتی ہے
 تو کہہ کہ وہ تمام گل زمین میں پہناں ہو گئے ہیں ان کی خاک پر سبزہ اگ رہا ہے۔ غالب نے اس
 خیال کو یوں بیان کیا ہے۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
 خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پہناں ہو گئیں
 اس غزل میں خسرو نے مسلسل بے ثباتی دنیا کا ذکر کیا ہے۔
 حسن کے پاس بھی تصوف بلا کا ہے اور وہی حقیقت و مجاز کا امتزاج ہے۔

از خلد و بہشت بے نیازم
 تا کوئی تو گشت منزل ما
 گر ز فراق حسن گم شدہ حیرتست
 ما کہ ترایا فتم یا فتم حیراں تریم

حسن اور خسرو کی شاعری کی عظمت کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ بڑے بڑے
 شعراء نے تتبع کیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز جیسے بزرگ نے حسن کی غزلوں کا تتبع کیا ہے۔ جس کا
 خود انہوں نے اپنے دیوان ”شمس عشاق“ میں ذکر کیا ہے۔

تغزل حسن سجزی۔ ایک مطالعہ

غزل کی قدما کے زمانے تک کوئی خاص شکل نہ تھی۔ پہلے قصیدے اور رباعی کا رواج تھا۔ بعد میں قصیدے کی جو تشبیہ ہوتی تھی اسی نے غزل کی شکل اختیار کی۔ سب سے پہلے نظامی گنجوی نے باقاعدہ غزل کے سانچے کو استعمال کیا پھر سعدی نے غزل کو صحیح معنوں میں ایک علاحدہ صنف سخن کے مرتبہ پر پہنچایا۔ امیر خسرو اور حسن کی غزل گویا خم خانہ سعدی و حافظ کی شرباب ہے جو دوبارہ کھنچ کر اور تیز ہو گئی ہے۔

صاحب شعر العجم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حسن کا صنف غزل پر خاص احسان ہے۔ ان کے اشعار سے بہ آسانی یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ جو سوز و گداز اور جذبہ و اثر ان کے کلام میں ہے وہ کشتہ محبت امیر خسرو کے پاس بھی نہیں امیر خسرو نے خود اس کا اعتراف کیا ہے:

خسروا شعر تو اسرارِ حدث است مگر
کز سخنائے توام بونے حسن می آید

مولانا ضیاء الدین برنی لکھتے ہیں:

”چوں کہ ان کی نظمیں اور غزلیں وجدانی اور رواں ہوتی ہیں اس لیے وہ سعدی ہندوستان کہلاتے ہیں اور ان کے دل پذیر اشعار سے سخنوروں کے دل راحت پاتے ہیں۔ ان کے کلام میں سعدی کے کلام کی چاشنی ہے۔“

خود اپنی نظم کے بارے میں حسن کی رائے ملاحظہ ہو:

بر نظم حسن دیدم شہرے شدہ دیوانہ

زیرا کہ نمی یابند این طرز بہ دیوانہ

حسن اپنی غزل کی برتری سے خوب واقف ہیں:

شعر حسن ، شعر متیں ، خاصہ غزل سحر میں

حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو حسن کے اشعار میں بلا کی ممانعت ہے اور کہیں بھی ان کے اشعار

ثقافت کی حد سے نہیں گرنے پاتے۔ ان کی شاعری بعض جگہ ساحری نظر آتی ہے۔

غزل کی خصوصیات میں سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز شامل ہیں اور اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ یہ معاملات جس زبان میں ادا کیے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ یعنی زبان سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو، قریب الفہم خیالات ہوں، جملوں میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ ہو۔ اگر یہ تمام چیزیں کسی شاعر کی غزل میں جمع ہو جائیں تو وہ غزل کا بہترین شاعر سمجھا جائے گا۔ حسن کے پاس یہ تمام چیزیں موجود ہیں بلکہ سوز و گداز کو انتہا تک پہنچا دیا ہے:

طیب علم ندارد ز درد ضربت عشق

چہ سود مند بود شربتی کہ او فرمود

یعنی علم کو عشق کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جبکہ اس نے عشق کی چوٹ نہیں کھائی وہ اگر میرے درد عشق کی دوا کرنا چاہے تو مجھے کیا فائدہ ہوگا۔

ہجری کیفیت یوں بیان کرتے ہیں۔ تیرے غم ہی سے میرے دل بے قرار کو قرار حاصل ہوتا ہے:

مسکین حسن ز وصل تو ماند است بد نصیب

باغم قرار دادہ دل بے قرار را

کبھی کہتے ہیں کہ تیرے فراق میں جان دے دینا آسان نہیں ہے لیکن اس سے بھی مشکل تیرے ہجر میں زندگی بسر کرنا ہے:

جاں دادن از فراق تو آسان نبود لیک

این زلیستن بہجر تو دشوار شد مرا

کبھی کہتے ہیں کہ میرا دل آتش کدہ ہے اور تو میرا خلیل ہے۔ تیرے ہجر کی وجہ سے میرا دل آتش کدہ بن گیا ہے۔ ایک دم کے لیے میرے پاس آ جا اور اس آگ کو گلستان بنادے۔

دارم دلے آتش کدہ آخر خلیل من توی

برمن فرود آ یک دمی آتش گلستان کن مرا

کبھی کہتے ہیں کہ میرا دل مانند شمع ہے اور ہر روز گزشتہ دن سے زیادہ جلتا ہے۔ شاعر اپنا حال محبوب کو لکھنا چاہتا ہے لیکن حال غم دروں ملاحظہ ہو:

کافذ زگریہ ترشد و خامہ ز آہ سوخت
شرح فراق خویش بتو چوں توان نوشت

غالب نے اسی مضمون کو اس طرح باندھا ہے:

حال دل لکھوں کیوں کر جاؤں ان کو دکھلاؤں

انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

کہتے ہیں انسان خاک سے بنا ہے اس لیے اس کو شراب سے سیری ہی نہیں ہوتی جس طرح ریت پر شراب ڈالنے سے جذب ہو جاتی ہے اسی طرح میرا حال ہے:

خاکیاں را نیست از منے سیرے

گوئی اندر ریگ می ریزند آب

کبھی اپنے گناہوں کا عذر اس طرح کرتے ہیں کہ گناہ جو مجھ سے سرزد ہوتے ہیں وہ میری طرف سے نہیں بلکہ گناہ گار نفس کی طرف سے ہیں:

ہرچہ نقش گناہ می بینی

آں ز نفس گناہ گار منت

کبھی کہتا ہے تیرا چہرہ دیکھ کر تجھ کو سجدہ کرتا ہوں میرے مذہب میں یہی نماز ہے:

رویت نگرم و سجدہ آرم

در مذہب ما ہمیں نماز است

اور آگے کہتے ہیں:

بر خاک رہت کنم تیمم

ہر جا کہ قدم نہی سعید است

کہتے ہیں کہ دنیا طلبوں کو محبوب حقیقی کا علم کیا ہو سکتا ہے۔ یہ دولت صرف درویشوں کے حصے میں آئی ہے۔ ان کے دل میں استناسوز ہوتا ہے کہ وہ اس ادراک کو حاصل کر سکتے ہیں۔

دنیا طلبان راچہ خبر از غم مولا
 این گنج بجز در دل درویش نیابی
 عشق میں جو حالات پیش آتے ہیں ان کے بیان کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں۔ اہل لکھنؤ نے
 اس کا نام معاملہ بندی رکھا کہتے ہیں عشق میں آسودگی ہی نہیں ہوتی:
 گفتم بر غم عاشقان آسائشی گیرم ز تو
 استغفر اللہ زین سخن عشق توو آسودگی

اپنے شب و روز کو حسن معشوق کے دم سے منور و درخشاں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا
 میں وہ کون سی آنکھ ہے جو تیرے چہرے کے فراق میں پر آب نہیں وہ کون سا دل ہے جو تیری
 جستجو میں نہیں ہے۔ میرے روز و شب تیرے دم سے منور ہیں یہ ماہ و مہر کا کام نہیں ہے:

کو دیدہ کز فراق رخ تو پر آب نیست
 کو دل کہ در کشاکش عشقت خراب نیست
 روزم تو بر فروز شبنم را تو نور بخش
 این کار تست کار مہ و آفتاب نیست

کبھی کہتے ہیں ہماری مستی کا باعث شراب نہیں ہے بلکہ یہ محبت عشق کی مستی ہے، شراب میں
 محبت کا کیف ہے اس پر کوئی احتساب نہیں ہو سکتا:

اے محتسب تو خیمہ بہ خمار خانہ زن
 بگزر ز ماکہ مستی ما از شراب نیست

عشق کے لئے سوز کا ہونا ضروری ہے اور وہی دل پختہ ہوتا ہے جو اس دولت سے بہرہ ور ہو،
 سوز دروں کے بغیر عشق بے معنی ہے:

دل نا پختہ بہ عشق لبوز
 خام بود ہر کہ درو سوز نیست
 دل کہ درو چاشنی سوز نیست
 محرم اسرار دل امروز نیست

کبھی کہتے ہیں کہ میں میرے عشق کو اپنی جان کی قیمت دے کر خریدتا ہوں اور یہ میری زندگی کا حاصل ہے۔

ما عشق ترا بجاں خریدیم
اینست ز عمر حاصل ما

لیکن اردو شاعر فانی نے کہا ہے:

جان سی شئے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان دامنوں تو یہ سستی ہے
اس مضمون کو حسن نے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے:

رسم عاشق چیت جان در عشق جاناں بانخن
ہم بیک داد نختین کفر ولماں بانخن
حسن عشق کو عشق کے معاملات سے بالکل الگ سمجھتے ہیں:

سر عشقت از دل عشاق پرس
عقل را زحمت مدہ این کارہ نیست
خرد معزول و عشق اندر تصرف
عس بیرون و دزد اندر حصار است

عشق کی تعریف میں کہتے ہیں:

طریق سہل پندار عشق بازی را
حقیقتیت غم عاشقی مجازی نیست
بوالجب مذہبیت مذہب عشق
ہر کہ توبہ کند گنہ گار است

بعض نہایت لطیف جذبات کو اپنی شاعری میں سمویا ہے:

اشکم ز تیغ غمزہ خوبان روان تراست
صبرم ز گنج وصل عزیزان روان تراست

حسن کے لطیف جذبات کی طرح ان کی زبان بھی لطیف، شیریں اور نرم و رواں ہے۔ ان کی غزل کے اکثر شعر تیر و نشتر کا درجہ رکھتے ہیں اور انداز گفتگو دل میں اثر کر جاتا ہے۔ خصوصاً مقطع میں وہ بڑی لطافت و نزاکت سے کام لیتے ہیں:

عالمی را غرق می بینم بہ دریائے طلب
تو کجا یابی حسن این گوہر نایاب را

عموماً شعرا اور اہل کمال اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ادب عالیہ کی ایک جداگانہ زبان بن جاتی ہے لیکن یہ شاعری کا بڑا نقص ہے۔ بلاشبہ شاعری میں ایسے خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ضرورت نہ ہو تب بھی شاعر علمی زبان استعمال کرے۔ خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور بول چال کی زبان ہونی چاہیے۔ قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی، خسرو اور حسن نے اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ حسن کی غزل اس نقص سے پاک ہیں۔ ان کے خیالات صاف اور واضح ہیں۔ ترکیبیں بھی سلیھی ہوئی ہوتی ہیں۔ محاورے کی صحت کا بھی وہ بہت خیال رکھے ہیں۔ رعایت لفظی کے بھی دلدادہ ہیں لیکن کہیں لفظی یا معنوی تعقید پیدا ہونے نہیں دیتے:

چو گل در جلوہ شد بلبل ہمیں گفت
کہ اکنون بے گلستان چون توان بود
اس شعر میں گل کی رعایت سے بلبل اور گلستان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں:
چشم نرگس، غنچہ لب، چوں سبزہ زارے کر دگل
پردہ از رخ برگزن مارا تماشا ئے بہ بخش
مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ:

”خواجہ حسن نے غزل میں ایک خاص طرز اپنایا تھا، تنگ قافیوں اور غیر معمولی ردیفوں میں شعر کہتے تھے ان کا کلام اگرچہ بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے مگر ایسا کلام کہنا سخت دشوار ہے۔ اسی وجہ سے اشعار سہل ممتنع کہے جاتے ہیں۔“

ہلالی نے حسن کے اشعار کی نزاکت کا اعتراف کیا ہے:

ہلالی از کمال شعر دارد منصب شاہی
کہ سوز خسروست و تازگی ہائے حسن با او

حسن نے اس خصوصیت کے لئے سعدی کا اتباع کیا ہے:

حسن گلے ز گلستان سعدی آورد است
کہ اہل معنی گنجین آن گلستان است

در خم معنی حسن را شیرہ نو ریخت عشق
شیرہ از خنخانہ مستی کہ در شیراز بود
حسن کی نمایاں خصوصیت لہجہ کا اہتمام اور اشارے ہیں۔ کبھی شعر میں ایسا لفظ لے آتے ہیں جو پورے جملے کا بدل ہو جاتا ہے:

بسیار خطا کردی ، باز آئی حسن انکوں
روئے بز میں آور ، درویشی درویشاں
(بطفیل درویشی درویشاں)

باحسن گفتی چرا عاشق شدی
صد جوابت میں سوال را

(و لے از راہ ادب جواب گفتن نمی توانم)

اکثر غزلوں میں ”صرف قوانی پر اکتفا کرتے ہیں اور ردیف کا سہارا نہیں لیتے اور اس کے باوجود غزل کے حسن میں کمی نہیں آتی۔ اکثر مشکل قافیہ اختیار کرتے ہیں۔ اور متداول بحر، ردیف اور قافیوں سے بچتے ہیں۔ ان کے دیوان میں متقدمین یا معاصرین کی زمینوں میں بہت کم غزلیں ملیں گی۔ بعض غزلوں میں ایک خاص لفظ کا التزام کر لیتے ہیں۔ مثلاً:

ماہ سبک سیرا مرا اشتربکار آید ہی

انہوں نے متروک الفاظ اور ترکیبیں اپنے معاصرین کے مقابلے میں زیادہ استعمال کی ہیں:

نزد تو آورد حسن قصہ عجز و بیکی
 تو بکمالِ مرحمت ، بیکس و عاجزش مہماں
 اہماں بمعنی، مگر زار، اسی طرح یکسوں بجائے یکسو، ہنر ہمہ، بجائے ہمہ، و فرمودگی، بجائے شنیدہ۔
 انہوں نے ”نزد“ اور شطرنج کی اصطلاحیں بھی بکثرت استعمال کی ہیں جیسے:
 چشم شوخ تو کہ در عین دغا اندازی
 مہرہ بر چسیدہ ازین سوختہ پا اندازی

نزد عشقت پاک می بازم ولے ترسم از انکہ
 کعبتین چشم غلطانی مرا بازی دہی
 باوجود صوفی ہونے کے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ کم ہے اور عاشقانہ رنگ غالب ہے جو
 اس زمانے کی خصوصیت ہے۔ اس زمانے میں صوفیائے کرام جو ہمہ اوست کے قائل تھے وہ
 اس مسئلہ کے علانیہ اظہار سے اجتناب کرتے تھے۔ حسن کے کلام میں جو صوفیانہ رنگ ہے
 ملاحظہ ہو:

تمام عمر مرا صرف شدہ بہ غواصی
 درے ہی طلسم کان بیچ دریا نیست

گر شوق سر زلفش از اہل وفا جوئی
 اندر تہہ خرقہ زمار بیرون آید
 کبھی کہتے ہیں میں نے بادشاہ عشق کو دیکھا، دعا کی۔ اس وقت پاسبان سو رہا تھا اور رحمت کے
 دروازے کھلے تھے اسی لئے دعا مستجاب دی:

شاہ را دیدم ، دعا کردم ، اجابت یافتہم
 پاسبان خفتہ و درہائے رحمت باز بود

مرغان غریبیم اسیر قفس بھر

ما زار قفس باز بہ بستان کہ رساند

کہتے ہیں کہ حسن ازل سے ہی مست الٹ ہے۔ میں اپنے محبوب کا پرانا دوست ہوں اس لئے
اس کی صحبت کو اچھی طرح پہچانتا ہوں:

از ازل جان حسن مست الٹ آمد علی

یار دیرینہ ششاد صحبت دیرینہ را

کہتے ہیں کہ اگر حسن میرے غم کی قدر کو نہیں پہچانتا تو اس کو معاف کر دے۔ تیرا عفو کامل ہے
میرے سامنے ایک مشت خاک کا گناہ کیا چیز ہے:

گر حسن قدر غمت نشاخت اورا عفوکن

پیش عفو کامل تو جرم مشت خاک چیست

کبھی کہتے ہیں حسن نے مجھے پایا۔ اس کی ساری مرادیں مل گئیں:

ہر کہ بتو رسید رسیدش ہمہ مراد

کشت رسیدہ رانم باراں چہ حاجتست

تیرا ملنا ترا نہیں ملنا

اور جنت ہے کیا جہنم کیا

گناہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ہم گناہ نہیں کرنا چاہتے لیکن ہماری فطرت ہی بد ہے وہ بہانہ
تلاش کرتی ہے۔

ما گناہی نہ کردہ ایم ولی

خونی بدرا بہانہ بسیار است

گفتی حسن چرا نہ کنی توبہ از شراب

واللہ کہ توبہ کردم و مستی نمی رود

کہتے ہیں تیرا دیوانہ ایک میں ہی نہیں بلکہ تمام عارف و عالمی تیرے دیوانے ہیں:
 در خالقہ کافہ ذکر لب شیرینش
 از حجرہ ہر صوفی خمار برون آید
 حافظ نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے:

بساط سبزہ لکد کوکب شد پپائی نشاط
 زبسکہ عارف و عالمی برقص برجستند
 میں ہر روز جو اختر شماری کرتا ہوں وہ اس لیے ہے کہ شاید کبھی میرا محبوب بھی مثل ماہ آشکا
 ہو جائے۔

مگر طالع شود یک شب چو ماہ
 حسن ہر شب ستارہ می شمارد
 دنیا کہتی ہے کہ صبر کرو لیکن میرے دل میں صبر کی جگہ ہی نہیں میرا ایمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔
 خلق گویند دل از صبر بجا آور باز
 اے دل از صبر نشانی ده اگر جائے ہست
 کبھی کہتے ہیں کہ محبوب نے وعدہ کیا تو ہے لیکن اس کا اعتبار نہیں اور نہ ہی صبر ہو سکتا ہے اور
 نہ تقاضا ہی ممکن ہے۔

طرفہ سروکاری است کہ با وعدہ معشوق
 صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد

کبھی کہتے ہیں:

دامن چو گل ، سرشک چو لالہ ، مژہ چو ابر
 مارا ہوائے عشق کم از نو بہار نیست
 سب لوگ خوشی کے غرمنے سے اپنا اپنا حصہ لے گئے لیکن میرا حصہ ابھی تک معین نہیں:
 ز گنج شادی ہر قوم قسمتی بردند
 منم کہ قسمت من تا کنون معین نیست

جدید اسلوب ملاحظہ کیجیے

می شکم بار غم عشق تو بردل کوہ کوہ
غرم صبر بیاد نیستی شد گاہ گاہ
یعنی تیرے غم کا بار میرے دل پر اتنا ہے کہ وہ غم کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ دا
کبھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

شاعر اکثر اپنے محبوب کو ماہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے دانتوں
حسن نے انہیں تشبیہوں کو نہایت لطافت بخش دی ہے:

در در صدف آن آب ندارد کہ تو داری


مہ بر فلک آن تاب ندارد کہ تو داری

میرے بحر کی تاریک راتوں کو تیرے رخ سے جو روشنی ساطع ہوتی ہے وہ منور کرتی ہے اور
میری روح کے چراغ کا تیل تیرا وصال ہے:

شب فراق مرا جز رخ تو روشن نیست

چراغ جان مرا جز وصال روغن نیست

جگر نے اسی خیال کو یوں باندھا ہے:

خیال یار سلامت تجھے خدا  ر

ترے بغیر کبھی گھر میں روشنی نہ ہوئی

اور فانی کہتے ہیں

گھر میں رہتا ہے ترے دم سے اجالا ہی کچھ اور

مہ و خورشید کی تنویر بدل جاتی ہے

زندگی کی بے شباقی کو حسن نے اس طرح بیان کیا ہے:

عمر ما یار چند روزہ ماست

عشق تو آشنائی دیرینہ

حسن کی جاذبیت اور جمال کے مختلف انداز پر استعجاب کا اظہار کرتے ہیں:

یوسفی یا ماہ گردوں یا فرشتہ یا صنم
دامنا عشق را لندر گماں افکنده

خورشید وہلال را قرآن کن
ے را وپیالہ را قریں کن

دل میں آگ لگی ہے اور وہ زلفوں میں اسیر ہے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ رات میں جگنو اڑ رہا ہے:

دل آتش گرفتہ در زلف

گوہر شب چراغ می بینم

جب تک مجھے حیرا وصال حاصل نہیں ہوا تھا مجھ پر ایک حیرانی طاری ہوئی تھی۔ لیکن جب حیرا وصل حاصل ہو گیا تو یہ حیرانی اور بڑھ گئی یعنی مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق باقی نہ رہا:

گر ز فرقت حسن گم شدہ حیرتست

ما کہ ترا یافتم ، یافتہ حیراں تریم

غالب نے اسی مضمون کو یوں باندھا ہے:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں

حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

محبوب کے لب کا وصف بیان کرنا تھا اسی لئے طوطی کو شکر خوار بنایا:

مگر وصف لب او خواست گفتن

کہ طوطی را شکر خوار آفریدند

حسن بھی حافظ کی طرح نقد کو ش ہیں کہتے ہیں:

تیری صحبت ہی میرے لیے بہشت ہے مجھے آگے ملنے والی بہشت کا خیال نہیں۔

بہ نقد امروز با او در بہشتم

مرا بانسیہ فردا چہ کا راست

از خلد وہشت بے نیازم
تا کوئے تو گشت منزل ما

اسی مضمون کو آتش نے دہرایا ہے۔

ہے میر یہ کہ دیکھیں وہ میر ہو نہ ہو
کوئے جاناں اور ہے گزار رضواں اور ہے
کبھی خیال آتا ہے کہ جوانی میں تو سوائے گناہ کے کچھ نہ کیا اور بڑھاپے میں جب سفید آجائے تو
پھر بال کالے نہیں ہوں گے:

جرسیہ کاری نکردی تا سیاہت بود موئی
چوں سفیدت شد کنوں بعد از سیاہی رنگ نیست
میر نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ان کے محبوب کا چہرہ خود ان کے لیے نو بہار ہے اسی عالم میں غراں بھی آجائے تو کوئی بات نہیں

ہمہ عالم اگر غراں گیرد
روئے تو نو بہار است مرا

کبھی کہتے ہیں:

گر اسیرم کنی و گرب بخشی
اختیار تو اختیار من است

غرض کہ حسن کے کلام میں ایک نیا پن اور شگفتگی ہے جو ان کے پیش رو شعرا سے
انہیں ممتاز بناتی ہے۔ حسن کی اکثر غزلیں مسلسل ہیں اور ایک ہی مضمون کو ان میں پیش
کیا گیا ہے۔ چوں کہ حسن کا کلام سوز و دروں سے مملو ہے اس لیے پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتا
ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حافظ و شعر حافظ

حافظ اپنے معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی حیات سے اپنی شاعری کا آغاز کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں اور اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے مظاہر کی جستجو کرتا ہے۔ برگ گل خوش رنگ اور موسم بہار کی عطریں ہوائیں درختوں پر لٹکے ہوئے نئے سبز پتے صوت ہزار اور رقص و سرور، لالہ کے ارغوانی جام، نرگس کی چشم نگراں اور سوسن کی زبان، حافظ انہیں فطرت کے دلکش مناظر کو زندگی کے اس انبساط اور لطف کا پیغامبر اور شریک بناتا ہے۔ حافظ اپنے شبستان کیف و سرود میں جو شمع جلاتا ہے وہ ہماری روح میں یک بیک جگمگا اٹھتی ہے۔ پھول کی پنکھڑیوں کی نزاکت و نکہت اور نسیم بہار کی جان پروری و آب رکتا آباد کی شنگ ہوا کی تسکین سے حافظ ہمارے اندر ہماری روح کو معطر و شاداب کر دیتا ہے۔ محبت کے زمرہ میں شیخ حافظ کی نظر بہت وسیع ہے وہ معاشرہ کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں پر بھی نظر رکھتا ہے۔ اور کہہ اٹھتا ہے۔

ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بہیم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شرمی بہیم
ابہان راہم شربت زگلاب و قند است
قوت داتا ہم از خون جگر می بہیم
اسپ تازی شدہ مجروح بنیر پالان
طوق زرین در صمہ گردن غری بہیم
دختران راہم جنگ است وجدال بامادر
پسراں راہم بدخواہ پدر می بہیم
بیچ رحمہ نہ بردار یہ بردار دارد
بیچ شفقت نہ پدر را بہ پسری بہیم

بنام خدا



لسان الغیب حافظ شیرازی

پند حافظ بشنو خواجہ برونی کی کن

زانکہ پند بہ از در و گہر و می بینم

مشہور ہے کہ ایک دن حافظ ”بابا کوہی“ کے مزار پر گئے اور بہت آہ وزاری کی رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ انکو لقمہ کھلاتے ہیں اس دن سے کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔

حافظ نے غزل کے علاوہ قصیدہ وثنوی پر بھی طبع آزمائی کی انوری نے غزل کی بنیاد ڈالی خسرو حسن نے اس کو ترقی دی اور حافظ نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔
صائب حافظ کے تتبع کا اس طرح اقرار کرتے ہیں۔

رواست صائب اگر نیست از رہ دعوی

تتبع بولی غزل گرچہ بے ادبیت

سلیم نے لکھا ہے۔

سلیم معتقد غزل خواجہ حافظ باش

کہ نشہ بیش بود در شراب شیرازی

عرفی جیسے خود دار شاعر نے بھی حافظ کے کلام کا اعتراف کیا ہے۔

برآں تتبع حافظ رواست چوں عرفی

کہ دل بہ کارد و درد مخوری داند

سب سے بڑی چیز جو حافظ کے کلام میں ہے وہ حسن بیان، خوبی ادا، شائستگی اور لطافت ہے۔ حافظ اپنے خیال کو لفظوں میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ جادو بن جاتا ہے یہ بات حافظ کے علاوہ فارسی ادب میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے خاص مضامین جو شعر میں بیان ہوتے ہیں وہ قناعت، گوشہ نشینی، دنیا سے اجتناب و اعظوں کی پردہ داری، رندی اور مستی ہیں۔ یہ مضامین صدیوں سے پامال ہوتے آئے ہیں لیکن آج تک حافظ کا جواب نہ ہو سکا۔ غزل کی ایک خاص زبان ہوتی ہے جس میں نزاکت، لطافت، اور لوچ ہوتا ہے اس قسم کی زبان کے لئے خیالات بھی خاص ہوتے ہیں، علمی یا فلسفیانہ مضامین اگر ادا کئے جائیں تو

وہ رنگینی اور لطافت قائم نہیں رہ سکتی۔ حافظ کا یہ خاص اعجاز ہے کہ وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی، فلسفیانہ مضامین ادا کرتے ہیں لیکن غزل کی لطافت میں فرق نہیں آنے پاتا۔ ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات ان کی غزل میں داخل ہو کر رنگین و لطیف بن جاتے ہیں۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر درقی نامہ ایست معرفت کردگار

فارسی شاعری میں جوش بیان نظامی اور فردوسی کے پاس ملتا ہے لیکن خاص موقعوں پر حافظ کے یہاں ان کے جذبات ان کے حالات کی پوری پوری ترجمانی کرتے ہیں اور سننے والے پوری قوت سے متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی سے متعلق لکھتے ہیں۔

اعتماد نیست بر دور جہاں

بلکہ برگردوں گردان نیست ہم

کبھی کہتے ہیں۔

کشتی نشستگانیم اے باد شرط برخیز

باشد کہ باز بینم آن یار آشورا

اور کبھی اپنی منزل سے ناواقفیت کا اظہاریوں کیا ہے۔

ما نادانیم کہ منزل گہ مقصود کجا است

این قدر ہست کہ بانگ جرے می آید

اور کبھی اپنے دل کو غم دنیا و غم معشوق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں بادہ اگر خام ہو تو وہ

ہمارے دل کے شیشہ کو پختہ کرتا ہے۔

درد دل ما غم دنیا غم معشوق شود

بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ را

واردات عشق تمام شعراء کے پاس پائے جاتے ہیں۔ لیکن قنوطیت کے ساتھ حافظ اس

کو ایک فن شریف سمجھتا ہے۔ اور بھی عشق مجازی کو بھی اپنے دوست کی تنہائی پر رحم کھانے

کی درخواست کرتا ہے۔

پروانہ و شمع و بلبل ہمہ جمع اند
اے دوست بیا رحم بہ تہنائی ماکن
کبھی کہتا ہے۔

بساط سبزہ لکد کوب شدہ پائی نشاط
زبس کہ عارف و عامی برقص بر جستند
عجوب کو کبھی ترک شیرازی کہتے ہوئے اس پر سمرقند و بخارا پنچا اور کر دیتا ہے۔ اور
کبھی اس کے محراب آبرو کو نماز میں خلل ڈالنے والا سمجھتا ہے۔

می ترسم از خرابی ما کہ می برد
محراب آبروئے تو حضور نماز من
کبھی کہتے ہیں کہ زاہد کی ریاکاری سے کہیں اس کی جنت ہاتھ سے نہ چلی جائے
ترسم کہ صرفی نہ برد روز باز خواست
نان حلال شیخ زآب حرام ما

حافظ کے کلام کی جان فلسفہ ہے وہ زندگی کی تخیوں کو اپنے لئے اور دوسروں کے لئے
گوارا بنانا چاہتے ہیں کائنات کی ہزار گرہیں کھلنے کے بعد زندگی ایک راز سر بستہ نظر آتی ہے
صدیوں کی تلاش فکر بھی صحیح معنوں میں اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہر دانائے راز کی
زندگی میں کچھ ایسے لمحے ضرور آتے ہیں جب وہ محسوس کرتا ہے کہ
کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمر را

اور حافظ بھی ایک عالم جسم و روح اور اس کی گونا گونی کے حیرت و استعجاب میں فکر
کی نارسائی اور انسانی علم کی ہنوز تشنگی کا بھی کچھ حقیقت افروز اظہار کر بیٹھتا ہے اور
”حدیث از مطرب و منے گور از دہر کتر جو“

کہتا ہوا عشرت امروز کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ حافظ کیٹس کی طرح Beauty in Joy
اور Joy is Beauty کے ایک گہرے اور وسیع فلسفہ مسرت کی تکمیل کو ایک امید فردا
و آج کے تصور سے دعوت لطف و نظر دیتا ہے۔ حافظ کے اشعار ہماری رگوں میں خون کی رفتار

کو تیز کر دیتے ہیں۔ ذوقِ نبضوں کو سہارا دیتے ہیں۔ رکی ہوئی سانسوں کو تازگی بخشتے ہیں اور
یا سکو امید میں بدل دیتے ہیں۔

گل مراد تو آنکھ نقاب بکشايد
کہ خد متش چو نسيم سحر توانی کرد

کہہ کر حافظ زندگی کی کڑی منزلوں میں سارے وسوسہ حیات کے لئے ایک بڑا سہارا بن جاتا
ہے اور

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

کہہ کر نہ صرف انسان کی برتری بلکہ اس کو اپنے فرض کا بھی احساس دلاتا ہے۔ حافظ کے کلام
میں کسی موقع پر بھی تھکاوٹ و در ماندگی کا احساس نہیں ہوتا اس میں بلا کی اچھ ہے۔ اور

اگر زمانہ بہ تو نسا زد تو بہ زمانہ ستیز

کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ حافظ عیش پرستی نہیں عیشِ کوشی کی دعوت دیتا ہے۔ اور فرصت
حیات کو غنیمت سمجھنے اور زندگی کو ہنسی خوشی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ حافظ زندگی کی
کٹافٹوں کو لطافتوں سے بدلنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

حافظ کے مزاج میں ہزاروں سال کا ایک تہذیبی میراث کے زیر اثر ایک خاص نرمی،
شرافت ٹھہراؤ، نیکی اور واقعی ایک عظیم شخصیت کی بردباری تھی۔ اور یہی اس کی شاعری کا
مزاج ہے۔ وہ جہاں دیدہ تھا اور اس کے ذہن کے دروازہ ہمیشہ کھلے رہے اس نے بھی تنگ
نظری کا اظہار نہیں کیا اور اسی لئے وہ کہتا ہے۔

آسائش دو گیتی تفسیر آں دو حرف است

با دوستان مطلق بہ دشمنان مدارا

وہ خود خوش رہنے اور دوسروں کو خوش رکھنے کے وسیع مسلک پر گامزن ہے۔ اور اس
نے کبھی ترک دنیا کی تعلیم نہیں دی بلکہ اس کو انسانوں کی ذہنی و جسمانی آسودگی سے ہمیشہ
گہرا ربط رہا ہے۔ حافظ جانتا ہے کہ زندگی کا راستہ پر خار ہے۔ اس میں سینکڑوں غم و اندوہ
شامل ہیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ انسان آلام روزگار کی پروا نہیں کرے بلکہ آج جو میر ہے اس کو

خوشی سے گزارنا چاہیے۔ اور کہتا ہے۔

اے دل از عشرت امروز بہ فردا اگنی
مایہ نقد بقا را کہ صمنان خواہد شد
اور کبھی کہتا ہے۔

غنیمت داں دی خود در گلستان
کہ گل در ہفتہ دیگر نباشد
حافظ کے کلام میں عام طور پر تلخی اور غم نہیں پایا جاتا لیکن اپنے طبقے کی خراب حالت اور
امیروں اور اہل اختیار کے ہاتھوں ان کی بے عزتی اور ناقداری سے وہ تلملا جاتا ہے اور کہتا ہے۔

فلک بہ مردم ناداں دہد زمام مراد
تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہست بس
اور کبھی کہتا ہے محتسب در خفاے رندان است

تو اہل دانش و فضلی ہمیں گناہست بس کہیں کہیں حافظ کے کلام میں شدید قسم کی
تقدیر پرستی پائی جاتی ہے اور انسان کو قطعی مجبور اور بے بس بتایا گیا ہے۔
بر عمل حکمیہ مکن خواجہ کہ در روز ازل
توچہ دانی قلم صنع بنامت چہ نوشت

حافظ کے کلام میں عشق و محبت کی سرخوشی اور ہمہ گیر جذبے کی لطافت سے پیدا ہونے
والے احساسات کا کیف و سرور ہے۔ اسی تصویر کا دو سر ارج المناکی اور دل کو پگھلا دینے والی
بے چینی ہے جو شعر حافظ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب مختلف اسباب بنیاد پر محبت اور
دوستی یعنی نشاط حیات کے بنیادی محرکات کی راہیں مسدود نظر آتی ہیں اور وہ اپنے غم میں
عندلیب کو شریک کر لیتا ہے۔

بنال بلبل اگر بامنت سر یاری

کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

اس کے نزدیک عشق و محبت اور صدق و صفا لازم و ملزوم ہیں بغیر سچائی کے زندگی میں

خیر و برکت ممکن نہیں۔ اور اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار کرتا ہے۔
 بصدق کوش کہ خورشید زاہد از نفست
 کہ از دروغ سیہ روی گشت صبح نخست
 اور کبھی کہتے ہیں

از مایہ حکایت ہر و وفا میرس
 حافظ انسانوں کو دوستی و آشتی کی تعلیم دیتا ہے۔

درخت دوستی بنشاں کہ کام دل بہار آرد
 نہال دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

حافظ کا تعلق بھی اس زمانہ کے دوسرے علماء و فضلاء کی طرح شاہی دربار سے تھا۔ حافظ
 نے اپنی زندگی میں یہی عظیم شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی کہ بنگال اور دکن سے لیکر
 سمرقند و بغداد و شام تک جہاں فارسی کا رواج تھا ان کا طوطی بولتا تھا۔

غرض کہ حافظ کو جہاں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی وہیں دوسری طرف سے ان پر
 بہم حملے اور اعتراضات ہوتے۔ بعض علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا اور ایک روایت کے
 مطابق ان کی نماز جنازہ میں شرکت اور ان کے دفن کو ممنوع قرار دیا گیا تاریخ ادبیات ایران
 میں میرامن نے رسالہ ”لطیفیہ عینیہ“ کے حوالے سے لکھا ہے۔

فارسی غزل میں عرفی کی شاعرانہ

عظمت و انفرادیت

جس طرح ہر شخص صاحب ثروت نہیں ہوتا اسی طرح ہر شاعر و ادیب صاحب طرز نہیں کہلایا جاسکتا۔ یہ دولت ہر کسی کو نہیں ملتی۔ ایک سیدھا سادا انداز بیان، بالکلین، لغات، اور موزونیت کا احساس تو ہم کو اکثر کے پاس مل سکتا ہے، لیکن ایک طرز خاص ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یہ دراصل ایک انوکھے پن، ندرت اور انفرادیت سے وجود میں آتا ہے۔ طرز میں انفرادیت اور ندرت نتیجہ ہوتی ہے شخصیت کی ندرت کا جس شخصیت میں جتنی توانائی اور آب و تاب ہوگی اتنی ہی اس کے طرز میں رعنائی آئے گی۔ اسی نسبت سے ہم کسی ادب پارے یا ادیب کو شخصیت اور طرز خاص کا آئینہ کہتے ہیں۔

شخصیت کو مرکب اثرات کا مرکب سمجھئے۔ اس میں موروثی خصوصیات، گھریلو ماحول ابتدائی تربیت، گرد و پیش کی زندگی سب کا نقش جلوہ گر ہونا چاہیے۔ سہتاغہ عرفی کی انفرادیت اور عظمت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہم کو اس کی شخصیت کے اہم ابعاد کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ عرفی شیراز کے ایک ممتاز گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ اس کا باپ زین العابدین، ایران کے اہل عرفہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا اور اس مناسبت سے اس نے عرفی تخلص اختیار کیا۔ چوں کہ ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لحاظ سے اس کی تعلیم بھی اعلیٰ معیاری ہوئی۔ صفوی سلطنت کا ستارہ عروج پر تھا۔ ایران میں ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ عرفی فطرتاً شاعر تھا اور اس ماحول نے اس کی نشوونما کی اور وہ ابتدا میں ہی بڑے بڑے شاعروں سے ہمسری کرتا تھا۔ اس کو ابتدا سے ہی اپنے کلام اور جدت طبع کا خوب احساس تھا جس سے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ پھر اس کی طبیعت میں ایک غیر معمولی خودداری، بلند ہمتی، سنجیدگی اور پاکیزگی بھی شامل تھی۔ مگر ان سب میں خودداری کا جذبہ غالب تھا۔ اس کی خودداری نے

اس کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے کو کسی دربار سے وابستہ کرے۔ سب سے پہلا مدحیہ قصیدہ حکیم ابو الفتح کی شان میں لکھا مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی مجبوری کے تحت لکھا گیا تھا۔ گو عرفی کی خوددارانہ طبیعت مدح گوئی کے لیے بظاہر موزوں نہ تھی لیکن شاید وہ زمانے کے ہاتھوں مجبور تھا۔ قصیدے بہر حال اس کو لکھنے ہی تھے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس میں بھی عرفی نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں وہ اپنے ممدوح کے ساتھ خود اپنی مدح نہ کرتا ہو۔ یہاں تک کہ نعتیہ قصیدے میں بھی اس روش کو برقرار رکھتا ہے۔ لیکن وہ سمجھتا ہے کہ قصیدہ اس کا موضوع نہیں:

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی
تو از قبیلہ عشقی و علیفہ ات غزل است

اس کی غزل میں جو تاثیر، کیفیت اور جادو ہے اس کا ازہی ہے کہ اس نے اپنی شاعری کے شیش محل کو اپنے تجربات کے آنوس سے سجایا ہے۔ ان تجربات کو کبھی براہ راست بیان کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی استعارہ و کنایہ کے فانوس چرمھادیتا ہے۔ مگر یہ بات قطعی ہے کہ وہ نہ اس دور کے مذاق سخن سے متاثر ہوتا ہے نہ عام جاری رنگ میں اپنے کو ڈھلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ اپنی زندگی کی محرومیوں، کامرانیوں، سرشاریوں، آرزوؤں اور نشاط و جستجو کے اس اظہار سے تسکین حاصل کرنے کے لیے اس نے فطری انداز میں غزل کہنا شروع کیا۔ اور اسی غزل کے سرمایہ کو ہم عرفی کی زندگی کا حاصل کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اس کی شخصیت ابھرتی ہے۔

بہ ہر سو می روم بوئے چراغ کشتہ می آید
مگر وقتے مزار کشتگان عشق بود این جا
ہمیں بس است دلیل بقائے عالم عشق
کہ یک شب غم او در ہزار سال گذشت

عرفی نے مضمون آفرینی اور نازک خیالی سے غزل کے میدان کو وسیع تر کیا۔ قوت تخیل سے شاعری کی دنیا میں نئی نئی راہیں نکالیں، قنصع کے بجائے سادگی کو اپنا شعار بنایا اور اس کے

ساتھ پرکاری کو شامل کیا:

گزشت و سوختم از انتظار و باز ندید

درین دیار مگر رسم باز دیدن نیست

امرد پرستی کا داغ فارسی شاعری کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ غزل کے لغوی معنی عورتوں سے باتیں کرنا ہے۔ فارسی غزل کا معشوق صنف نازک کے بجائے شوخ طرح دار بچہ نظر آتا ہے۔ حافظہ کا دلبر بھی ترک شیرازی ہی ہے۔ جس کے ہاتھ ایک تل کے عوض وہ سر قند و بخارا کو بخش سکتا ہے۔

اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا

بخال ہندوش بخشم سر قند و بخارا را

مگر عرفی کے پورے کلام میں کہیں ایسے نشانات نہیں ملتے جس سے اس کے محبوب کے خدو خال معین کیے جاسکیں یا اس سے اندازہ ہو سکے کہ اس کا محبوب کس صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے عشق کی لاج رکھ لی:

عشق عصیان است گر مستور نیست

غزل کا مضمون ہی حسن و عشق ہے لیکن عرفی نے ہر جگہ اخلاق و شرم و حیا کا پاس کیا ہے۔ اس کے کسی بھی شعر سے رندی اور بواہوسی نہیں جھلکتی بلکہ وہ عشق کے اعلیٰ جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ عشق کے مرتبے کو سمجھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ یہاں ذرا سی غفلت بھی قابل معافی نہیں:

ہاں راہ عشق است کج رفتن ندارد باز گشت

جرم را این جاعقوبت ہست استغفار نیست

اس کے باوجود بھی وہ واردات و معاملات عشق کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے۔ اور ان کو شاعرانہ انداز میں بیان کرتا ہے:

ترک دل جوئی کند چوں منتقل کردم بلطف

بہ کسمان شرم روئے ہمسایہ آید گرود

موبہ موہم دوست شد ترسم کہ استیلائے عشق
یک اما الحق گوئی راگیر بر سر دار آورد
خودداری کا دامن عشق کے کوچے میں بھی اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا:

در پذیرم صد غم و نکشایم از و سعی لب
دل بہ ماتم دوست لا تائب بہ شیون دشمن است
وصل لیلیٰ مطلب مجنوں نبود اورا مدام
لذت آوار گہا دشت پیمہ کردہ بود

اس کے نزدیک غم کی تشہیر کم ظرفی کی علامت ہے۔ عرفی اس کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا:

فغاں نہ شیوہ اہل دل است ای بلبل
و گر نہ من بہ تو افروں غروش لی کردم
حافظہ بلبل کو دعوت گریہ دیتے ہیں تاکہ دونوں دل جلے مل کر آہ وزاری کریں:

بنال . بلبل اگر بامنت سر یاریست
کہ مادو عاشق زاریم کارما زاریست

لیکن عرفی کے پاس عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو زندگی میں سوز و ساز پیدا کرتا ہے اور وصل کی خواہش نہیں رکھتا وہ وصل اور بواہوسی کو ایک جانتا ہے:

چگونہ سوز غم او وہم بسوز دگر
کہ دل فروغ نہ یابد بہ دل فروز دگر

جب دل و دماغ میں ہر دم محبوب کا تصور ہو تو اس کو بھر نہیں کہتے یہ بجائے خود وصال دوست ہے:

ز صد وصال نیاید شب انچہ من بخیال
ز شیوہ ہائے تو با عقل و ہوش می کردم

عرفی کا محبوب ایرانی معشوق سے بالکل الگ صفات کا حامل ہے۔ شوخی، دلربائی، دلکشی،

عصمت و حیا اس کے پاس ہے اور وہ جیتا جاگتا انسانی کردار پیش کرتا ہے۔ وہ نہ چراغ محفل ہے اور نہ کسی کی آغوش کی زینت ہے:

عاطے در جلوہ و عاشق نہ پسند غیر دوست
گرد مجنوں پرسی اندر کارواں محل یکی است
وہ محبوب کے نام سے خدا کو بھی آشنا کرنا نہیں چاہتا:

غیر تم بین کہ بر آرمده حاجات ہنوز
از لبم نام تو ہنگام دعا شنید است
جذبات عشق، سوز و گداز، رنج و الم، حسرت و یاس پر منحصر ہیں۔ جو شاعر جتنا زیادہ اس آگ میں جلتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں سوز و گداز اور اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اردو شاعری میں ہم میر کے کلام میں پاتے ہیں۔
عرفی کا عشق ایک روحانی کیفیت ہے جو فطرت کی طرف سے ہر مذاق سلیم کو عطا کی گئی ہے جس میں ہوس کا شائبہ نہیں:

مازم بہ حسن و عشق کہ از جام اتحاد
مستند در میانہ حیا کم نمی شود

یہ شعر اس کے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اس کے پورے کلام میں کہیں بھی اس کی تردید نہیں ملتی۔ اس کا عشق اصلیت پر مبنی ہے۔ نہ تو عشق کی جولانیوں میں آسمانوں کی خبر ملتی ہے نہ زمین کی پستیوں کی۔ بلکہ عام انسانوں کی طرح اس دنیا میں رہتا ہے۔

غزل میں چوں کہ عشقیہ شاعری ہوتی ہے۔ اس لیے صرف یہ ہجر و وصل، یزم و خلوت تک محدود تھی۔ صرف عاشق کی مرادوں کی معراج تھی۔ فارسی غزل میں عام طور پر اخلاقی مضامین نہیں ملتے اور اگر ملتے ہیں تو وہ بالکل خشک فلسفہ بن جاتے ہیں جس میں شاعری باقی نہیں رہتی۔ عرفی نے اس صنف سخن میں نئے موضوعات و مضامین کو اپنا کر غزل کی دنیا کی وسعتوں کو کہیں زیادہ وسیع کر دیا ہے۔ اور اخلاقی مضامین بھی اس خوبی سے نظم کیے ہیں کہ ان میں بھی عجیب لطف و اثر پیدا ہو گیا ہے۔

عجز و انکساری، خاکساری، کو وہ قطعاً پسند نہیں کرتا:

کفران نعمت گھمندان بے ادب
درکیش من و شکر گدایانہ بہتر است

کسی کا احسان لینا اس کی سرشت میں ہی نہ تھا۔ اگر خدا بھی بغیر کسی عوض کے بہشت عطا کرتا ہے تو وہ اس عطیے کو بھی ٹھکرا دیتا ہے:

گرفتم آن کہ ہشتم دہند بے طاعت

قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف است

جو شخص خدا کی عنایت اور مہربانی کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے وہ خضر کے التفات کو کہاں خاطر میں لاسکتا ہے:

خضر اگر برب کس منت آجے دارد

بگذر از چشمہ حیوان کہ سراپے دارد

جب قناعت و استغنا داخل سرشت ہو تو حاتم کی داستانیں دل کو نہیں لہجائیں:

بیابہ ملک قناعت کہ درد سر نہ کشی

ز قصہ ہاکہ بہ ہمت فروش طے بستند

دنیا فانی ہے ہمارے جیسے ہزاروں مسافر آئے اس دنیا میں۔ ایک ایک قبر میں ہزاروں لوگ مدفون ہیں تو اس پر نماز کرنا کیا معنی اور ہم یہ کیوں سمجھیں کہ ہمارے بغیر دنیا چل نہیں سکتی۔ ہم نہ ہوں گے مگر دنیا تو چلتی رہے گی۔

اخلاقی مضامین کے ساتھ ساتھ اس نے فلسفے اور شاعری کو بھی ایک جان کر دیا ہے۔

کم و بیش سب ہی شاعر و ادیب اپنی اپنی قوت پرواز کے مطابق ذات باری کے بارے میں خیال آریاں کرتے رہے ہیں لیکن عرفی نے اس شعر میں جس طرح اس کا اظہار کیا ہے۔

براگن پردہ تا معلوم گردد

کہ یاران دیگرے رومی پرستند

شاید ہی اس سے بہتر کسی اور شاعر نے کہا ہو اور پھر یہ شعر ملاحظہ ہو:

آمان کہ وصف حسن تو تفسیر می کنند
خواب ندیدہ را ہمہ تعبیری کنند

وہ کفر و اسلام کی تفریق کو برا سمجھتا ہے۔ ذات باری کا جلوہ چاہے کہیں بھی ہو وہ عاشقان صادق کے لیے کشش کا باعث ہے:

عاشق ہم از اسلام جدا است ہم از کفر

پروانہ چراغ حرم و دیر چہ داند

ہرگز مگو کہ کعبہ زمت خانہ خوشتر است

ہر جا کہ ہست جلوہ جانان خوشتر است

مختصر یہ کہ عرفی کی انفرادیت اور جدت کا اس کے سب دوست اور دشمنوں نے اقرار کیا ہے۔ اس کو ایک طرز خاص قرار دیا ہے۔ قصیدہ ہو یا غزل اس کا طرز اس پر ختم ہو گیا۔ اس کی شاعری میں سادگی اور جوش مل کر ایک عجیب امتزاج پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی مضمون آفرینی کے متعلق شبلی فرماتے ہیں:

”عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا دوست اور دشمن دونوں نے اقرار کیا ہے اس میں مطلق شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی قوت تخیل نہایت زبردست تھی لیکن اس زمانے کا مذاق، مبالغہ جدت، تشبیہ اور حسن تعلیل وغیرہ پر صرف ہو جاتا ہے۔ اس کی قوت تخیل بڑھی ہوئی تھی اس لیے عرفی نے سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کیے جن سے جدت اور طرنگی کے علاوہ نفس مضمون پر خاص اثر پڑنا لازمی تھا۔“

عرفی کے طرز کی خوبی اس کی معنی آفرینی اور صرف اعلیٰ تراکیب کی تازگی اور ندرت میں ہی نہیں ہے۔ اگرچہ ان تراکیب میں حسن کاری بھی اور بلاغت بھی ہے عرفی کے یہاں

فلسفہ اور تصوف کے ساتھ اصلیت و واقعیت ہے۔ اس کے پر معنی و پر خلوص گہرے تھر تھراتے ہوئے جذبات و واردات کے لیے اس کا اسلوب موزوں ہے۔ ظاہر ہے کہ جامہ زیبی حسن کو ہی زیب دیتی ہے۔ خالص غزل کے لحاظ سے ہم عرفی کو صرف سعدی اور حافظ کی صف میں جگہ دے سکتے ہیں۔

بیدل

شعر الحُمّ فی الہند میں شیخ اکرام الحق نے مرزا بیدل کے متعلق یوں لکھا ہے۔ ”مرزا عبدالقادر بیدل عہد عالمگیری کے عالی مقام شاعر ہیں، انھوں نے اورنگ زیب عالمگیر کا عہد اول سے آخر تک دیکھا اور اسکے بعد کا وقت محمد شاہ رنگیلے تک بسر کیا، جہاں ایک مضبوط حکومت کے زیر سایہ شرعی حد بندیوں کی سختی سامنے آئی وہاں سیاسی بد نظمی کے سبب تعیش اور تن آسانی کی زندگی کی آوارگی بھی پیش نظر رہی، فکر مندی کا دور تھا بیدل جو ایک طبع آزاد اور فکر رسا رکھتے تھے ان مواقع سے پوری طرح بہرہ مند ہوئے۔ مگر انکی شاعری اپنے ماحول کے خلاف ایک گونہ بغاوت تھی۔ اس جذبہ نے انکی طبیعت کی موزونیت کو اور بھی جلادے دی۔“ (ص ۱۲۷) طبع لاہور ۱۹۹۱ء

چہار عنصر میں جو بیدل نے اپنی عمر کے چالیسویں سال میں لکھی۔ ان شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے جس سے مرزا کی طبیعت متاثر ہوئی اور یہ چھ ہیں۔ شیخ کمال، شاہ ملوک، شاہ یکہ، شاہ فاضل، شاہ ابوالقاسم، شاہ کابلی۔ یہ سب اکابر تصوف سمجھے جاتے تھے۔ اور بیدل کی شاعری کے محرک تھے (چہار عنصر۔ مخزنہ سالار جنگ لاہور)۔

بیدل کی طبیعت غیر مرنی اشیاء اور اوہام کی طرف راغب ہوئی اور انکی شاعری تصورات کی صورت اختیار کر گئی۔

انھوں نے امراء و سلاطین کی مدح کو کبھی گوارا نہیں کیا خود لکھتے ہیں۔

اے کہ تعریف سلاطین کردہ
مشق تعلیم شیاطین کردہ

البتہ بہت زیادہ امراء سے انکے تعلقات تھے۔ عالمگیر باوجود شعر دشمنی کے بیدل کے اشعار سند کے طور پر پیش کرتا تھا۔

چہار عنصر میں انھوں نے اپنے واقعات اور دوسروں کے کمالات کا بیان کیا ہے انھیں

عملیات سے شغف تھا۔ وہ استغنا صفت، آزاد روش، فقیر منش، فقیر دوست تھے۔ انکی جسمانی صحت انکی فکری تنومندی سے ظاہر تھی۔ میر غلام علی آزاد کے قول کے مطابق بیدل نے ایک لاکھ کے قریب شعر کہے اور سخن کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ شنوی میں ”محیط اعظم“ ”عرفان“ ”طلسم حیرت“ اور ”طور معرفت“ قابل ذکر ہیں۔ کلیات، رباعیات، قصائد اور قطعات کا مجموعہ دیوان ہے۔

بیدل نے اپنی فکر کی تکمیل تخیلات اور تصوف سے کی تو اسکی تکمیل وحدت الوجود سے

آں جلوہ بے نشان کہ نے رنگ نہ پوست
پیدائی و پہنائی او حرف مگوست
کبھی کہتے ہیں کہ عشق کائنات کے ہر عمل میں جاری و ساری ہے۔
فسوں و افسانہ تو ومن فشانہ بر چشم و گوش دامن
غبار مجنول بدشت روشن، چراغ موسیٰ بطور پیدا
کبھی وہ کہتے ہیں کہ انسان یہ سب چیزیں دہرو کعبہ کا جھگڑا چھوڑ کر عشق سے لو لگالے

زندگی تاکی ہلاک کعبہ و دیرت کند
بہ کہ از دوش افگنی این جامہ احرام را
وہ کفر و دین اور شک اور یقین کے جھگڑوں کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی اصل وجہ پر خاش ہے۔

کفر و دین شک و یقین سازیت بے آہنگ و ربط
ہوش اگر داری بہ فہم اے بیخبر پر خاش نیست
انھوں نے عشق کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے یوں تو شعر اپنے دل کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

بغیر عشق ندانیم صحیح آئینہ
گزیدہ ایم چو پروانہ سوختن مذہب

وہ تسبیح اور زنا کی قید سے بھی آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ متاخرین مغلیہ شعراء میں تصنیع اور غرائب نگاری کا جو رواج شروع ہوا تھا بیدل اسے ایک قدم اور آگے لے گئے۔ اسکے ضخیم کلیات پر غنی اور ناصر علی سرہندی کے دواویں کی طرح نگہ انتخاب نہیں ڈالی گئی۔ اور چونکہ وہ علمیت اور فلسفہ میں ان سے بہت آگے تھا اس لئے باوی النظر میں اس کے کلام میں اشکال اور عزابت ناصر علی سے زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن بیدل کو ان پر بدرجہا فوقیت حاصل ہے۔ اسکے دیوان میں جو اشعار ہیں وہ معنی کے لحاظ سے بلند ہیں اور ہندوستانی شاعری پر اس کا احسان ہے۔ اس نے قلوب کو حقائق و معارف کی طرف متوجہ کیا۔ غنی کا طرہ امتیاز تمثیل تھا اور ناصر علی کا مضمون آفرینی تھا۔ بیدل کے طرز سخن میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ لیکن اس کی خاص وجہ امتیاز اس کی صوفیانہ شاعری میں تمثیلی رنگ ہے جس کی وجہ سے اہل ترکستان اور افغانستان مثل مولانا روم اس کی بھی تعظیم کرتے ہیں کہ اس نے طبیعتوں کو مجاز اور ظاہری اور عارضی باتوں سے ہٹا کر زندگی کی عمیق حقیقتوں کی طرف پھیرنا چاہا۔ اور اپنے اشعار کو حقائق و معارف کا آئینہ بنایا۔ بیدل میں انتہا کی جدت پسندی تھی نئی نئی بحروں میں غزلیں لکھنا اور زندگی کے حقائق کو الٹ پلٹ کر بیان کرنا اور اس سے بڑے دلچسپ اور نئے نئے نکتے پیدا کرنا ہے۔

گویند ز رنگہا برون باید بود
دشوار حقیقتے کہ ماہم رنگیم

زندگی کے متعلق بیدل کا خیال ملاحظہ کیجئے۔

در بخود سازیم جائے غیرت است
قید ہستی نیز تنگی بیش نیست

کبھی کہتا ہے کہ میرے محبوب کی زلفوں کے خیال میں مشک کی خوشبو ہے اسکے لئے نافہ ہرن سے مشک لانے کی ضرورت نہیں۔

پے نافہ ہای رمیدہ بوسپند زحمت جستجو

بخیاں حلقہ زلف او گر ہے خورد زقتن درا

اس شعر میں بیدل نے رعایت لفظی سے کام لیا ہے۔

ہم عمر باتو قدح زدیم ونہ آفت رنج خمار ما
 چہ قیامتے کہ غمی رسی زکنار مابہ کنار ما
 زہد و تقویٰ کہ متعلق بیدل کہتے ہیں کہ زہد و تقویٰ اپنی جگہ پراچی چیز ہے لیکن حقیقت
 تو یہ ہے کہ میں دل کا غلام ہوں یہ سب باتیں تو درد سر ہیں۔
 زہد و تقویٰ ہم خوش است اما تکلف برطرف
 درد دل را بندہ ام درد سری درکار نیست
 اس دنیا و عقبی کے متعلق بیدل کا خیال ہے کہ ان کے تخیل کی پیداوار ہے۔
 چہ دام است دنیا چہ نام است عقبی
 تو معماری این خانہ ہای گماں را
 بیدل جنت کے تصور کو سکون دائمی سمجھتے ہیں اور سکون دائمی عدم کے برابر ہے۔
 گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید
 جاتے کہ یہ داغ نہ پتہ دل چہ مقام است
 بیدل کے پاس مذہب ایک روش ہے۔ منزل نہیں، اسکے سنگ ہائے سفر مقامات راہ
 ہیں مگر مقصد سے دور، آزاد لوگوں کا مشرب یہی ہے کہ مذہب کی قیود سے دور رہے۔
 حسد تاکہ تعصب چند گر درد دلی داری
 نیاز زاهدان بے خبر کن در دینی را
 حسد اور تعصب کب تک اگر احساس محبت رکھتا ہے تو مذہب کا شغف زاہدوں کو
 بخش دو۔

بیدل وحدت الوجود کے قائل ہیں۔

حق جدا از خلق و خلق از حق بروں اوہام کیست
 تا ابد گرداب در آب است و در گرداب آب

یعنی خالق اور مخلوق ایک ہیں۔ ہمیں اپنی حقیقت کا احساس اس لئے ہوتا ہے کہ ہم
 حقیقت مطلق کے صفات کا مظہر ہیں۔ کائنات کے وجود کے متعلق کہتے ہیں کہ ایک لمحہ کا کام

ہے کن کا حکم ملا اور بن گئی جیسے ایک صفر کی تکرار سے اعداد بنتے ہیں۔

شور ہستی و عدم وقف سریر خامہ بود

کاف و نون گل گردد چندین طشت شوق از بام ریخت

انکا خیال ہے کہ صفات کائنات واقعتاً وجود میں آئی۔ بیدل کہتے ہیں کہ حقیقت کے
بڑے حقیقت ہیں۔ اور یہ تمام کائنات "آدم" کی تخلیق کی تیاری تھی۔

لیک تصویر کامل اینجا نیست

جز ہیولی ز شخص پیدا نیست

اور آدم کی مٹی تمام کائنات کے اسرار پر حاوی تھی۔

جسم اصلی ہمیں کف خاک است

کہ محیط رموز افلاک است

بیدل نے آئینہ سے مضامین پیدا کئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عدم صوفیہ کے نزدیک علم

نا ہے اور یہ آئینہ کے مشابہ ہے۔ دنیا کی صورتیں بعینہ اسی طرح جلوہ گر ہوتی ہیں جس طرح
نہ میں عکس منعکس ہوتا ہے۔

اندم کہ حقیقت قدم پیدا شد

دانی کہ چگونہ کیف و کم پیدا شد

رو دید ہستی آمد بہ وجود

خود را دید یم عدم پیدا شد

بیدل کے نزدیک اس دنیا کے علاوہ دوزخ، جنت، عذاب، ثواب یہ سب غلط ہے۔

مکچہ اسی دنیا میں حاصل ہے۔

نشاط اینجا ، بہار اینجا ، بہشت اینجا ، نگار اینجا

تو گر خود غافل صرف عدم کن دور بینی را

بیدل کے نزدیک حال ہی اصلی شے ہے ماضی و مستقبل صرف تغیرات ہیں۔ کائنات

نا نہیں ہوتی صرف اسکی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ دنیا مستقل حقیقت ہے جو ہر لحاظ بدلتی ہے۔

چہ دارد محفل تحقیق امروز است و بس
خاک بر فرق دو عالم و فردا کردہ اند
بیدل دل کو بہت ہی عظیم سمجھتے ہیں۔

عرش و فرش اینجا محاط وسعت آباد دست
کعبہ مارا سواد از تنگی اطراف نیست

یعنی عرش و فرش کی تمام وسعتیں ایک دل میں آباد ہیں۔ اور اسکا جو سیرا ہے وہ کعبہ کی
طرح ہے۔ بیدل انسان کی زندگی کو ذات باری کا پر تو سمجھتے ہیں وہ بالذات کچھ نہیں اسکا انجام
فنا ہے۔

جز فنا صورت نہ بند اعتبار زندگی
گر نبالدا یا بخود پیچید نفس جزو ہوا ست
بیدل انسان کو مختار محض نہیں سمجھتے بلکہ اس کو مشیت لہزدی کا پابند سمجھتے ہیں۔ اور
پھر بھی ایک حد تک وہ مختار رہے۔

این کہ مختار فعل نیک و بدیم
بیدل آئین اختیار نبود

تہمت حکم قضا را چارہ نتوان ساختن
اختیار از ماست چندانکہ مجبور یم ما

بیدل لذت نفس کو ترک کرنے اور بارگاہ ربوبیت میں انکسار و عجز سے بازیابی
حاصل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور انسان کی رہبری اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ اس کے قلبی
واردات ہیں۔ بیدل کے اشعار میں استعارہ۔ واقعیت نگاری۔ معنی آفرینی۔ اور نئی نئی
اصطلاحیں موجود ہیں۔ غرض کہ ان سب خصوصیات نے بیدل کے کلام کو بہت ہی دلچسپ بنا
دیا ہے پہلے اہل ایران بیدل کے کلام پر توجہ نہیں دیتے تھے لیکن آج کل ایران میں بیدل پر
بہت کام ہو رہا ہے۔ ”سفینہ خوشگو“ بندر اداس خوشگو کی کتاب ہے جو بیدل سے متعلق ہے۔

وہ بیدل کے شاگرد تھے۔

ڈاکٹر سید احسن الظفر نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بیدل پر تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کا ایک مقالہ اس بارے میں "قند پارسی" کے شمارہ ۱۰ مجلہ میں شائع ہوا ہے جو خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ اسلام کی طرف سے چھپا ہے۔ جس میں انہوں نے بیدل کے متعلق مختلف محققوں کی رائے کا اظہار کیا ہے۔

اولاً ایرانی محقق و دانشمند بیدل کے کلام کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ لیکن آج کل ایران میں بیدل کا مطالعہ بحیثیت ایک فلسفی و صوفی شاعر کے کیا جا رہا ہے اور اس کے کلام کو اہمیت دی جا رہی ہے۔ دوسرے ایرانی شاعروں سے اس کے فکر و فن کا تقابل کیا جا رہا ہے۔ بیدل کے کلام کی وسط ایشیا میں شہرت کے متعلق اس طرح لکھا گیا ہے۔

کلیات اشعار بیدل در سال ۱۲۹۹ در مطبع صفدری، بمبئی بہ چاپ رسیدہ است۔ پس از انکہ شیخ قلی "آثار بیدل" در آسیائی میانہ آمد منتخب غزلبا و رباعیات اور در کتب درسی گرفت (قند پارسی۔ م بیات۔ صفحہ ۳۴ شمارہ ۱۹۹۲۔ دہلی)

در تاریخ شعر تا بحکیم می خواہیم۔ خصلت شاعری "بیدل"۔ ادب شناسان (برآن داشت تا قرن ۱۸ و ۱۹ اسدہ "بیدل" بنامند) "بیدل و شبنوی حائش" قند پارسی، م بیات صفحہ ۳۴ شمارہ ۱۹۹۲ دہلی)

غرض کہ بیدل کے کلام کو شہرت حاصل ہو رہی ہے۔

غالب کا فکر و فن کلیات غالب کی روشنی میں

بود غالب عندلیب از گلستان عجم
من ز غفلت طوطی ہندوستان نامید مش

غالب خود اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ تورانی النسل ہیں۔ تذکرہ مظہر العجائب میں غالب نے اپنے حالات خود اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ یہ حالات موثق ہونے کے ساتھ ساتھ محمل ہیں۔ غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ خاں اور دادا کا نام قوقان بیگ تھا۔ مرزا کے والد سپاہ گری کرتے تھے۔ وہ پانچ سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ دستبوس میں خود غالب لکھتے ہیں

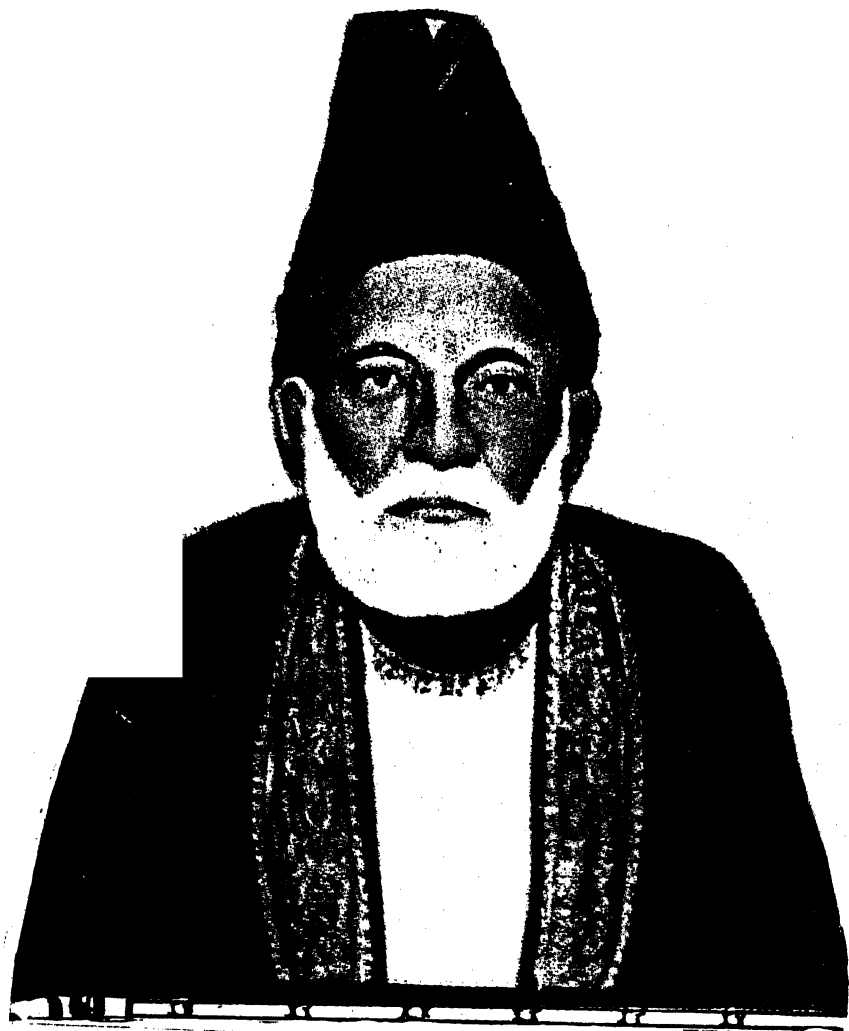
در پنج سالگی پدرم عبداللہ بیگ خاں بہادر۔۔۔ چراغ ہستی
فر و مرد۔۔۔ و گرامی او در من پسر خواند و مرا پرورد

نصر اللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش کی لیکن وہ بھی ۱۸۰۶ء میں ہاتھی سے گر کر ہلاک ہو گئے۔ اس کے بعد اپنے نانا غلام حسین کے پاس رہے۔

غالب نے اپنے فارسی کلیات میں اپنے تورانی النسل ہونے کے متعلق خود لکھا ہے۔

غالب از خاک پاک تورانی
لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی
بہ ستر گان قوم پیوندیم
فن آبائی ما کشا و رزیست
مر زبان زادہ سمرقندیم

فارسی زبان سے غالب کو طبعی لگاؤ تھا اور اس میں ان کا مطالعہ بھی گہرا رہا۔ جس شخص سے غالب نے فارسی زبان کے اسرار و رموز سیکھے ”وہ درفش کاویانی“ میں غالب نے اس کا نام



ہرمز ملا عبد الصمد بتلایا ہے۔ "مولانا ہرمزدم عبد الصمد این راز بامن می گفت (نقش آزاد مرتبہ مولانا غلام رسول مہر)

غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔

فارسی بین تا بہ بینی نقش های رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ منست

اور پھر کہتے ہیں

منکران شعر من ہاں تا نگوی حاسد مد

کایں قیاس از بہر شان سامان نانوی بودہ است

غالب نے انوری عرفی و خاقانی کو اپنا سلطان کہا ہے۔

انوری عرفی و خاقانی سلطان مہم

پا دشہ طہمورث و جمشید ہوشنگ منست

مرزا کو علم نجوم میں بھی کافی دستگاہ حاصل تھی اگرچہ طبیب نہیں مگر طب اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے فارسی کلام میں جابجا نجوم کی اصطلاحات اور احکام سے مضامین پیدا کئے گئے ہیں۔

بچپن میں ان کی شادی نواب الہی بخش خاں معروف کی لڑکی امراؤ بیگم سے کر دی گئی تھی۔ جو غالب سے دو سال چھوٹی تھی (غالب از مولانا غلام رسول مہر صفحہ ۴۰) انہیں تمام عمر شادی کی بندھنوں کا رونا رہا اور بیوی کو پیری سے تشبیہ دی۔ مرزا غالب لا ولد تھے۔ ۲۷ برس کی عمر میں بچے پیدا ہوئے لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوئی کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اور آخری عمر میں اپنے بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنالیا تھا جو جوانی میں داغ مفارقت دے گئے۔ غالب نے ان کا مرثیہ لکھا۔

مرزا کی طبیعت شراب کی طرف راغب تھی اور آخر دم تک وہ اس کو چھوڑ نہ سکے۔

غالب از مئے پرستی نگذرم

غوط در گرداب طوفان می زغم

مرزا غالب کی مفلسی و عسرت نے ان کی شاعری پر بہت اثر کیا۔ تمام عمر عسرت میں گذری۔ اور ہمیشہ قرض دار رہتے تھے خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ کوٹھی سے شراب، گندمی سے گلاب، بازار سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیا جاتا تھا (خطوط غالب خط ۲۲ صفحہ ۷۹)

حکومت انگریزی سے غالب کا تعلق بچپن سے تھا اور ان کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں کے توسط سے پیدا ہوا۔ جب ۱۸۰۶ء میں ان کا انتقال ہوا تو کارکردگی کے عوض ان کے متعلقین کی پیشن مقرر ہو گئی اور اس طرح سے مرزا غالب انگریزوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔ غالب طبعاً جدت پسند تھے۔ انگریزوں کی مادی ترقیوں کو دیکھ کر وہ اس سے مرعوب ہوتے۔ وہ شروع سے انگریزوں کے زیر اثر تھے اور کئی افسروں کی مدح میں انہوں نے قیصدے اور قطعے لکھے۔ انہوں نے ”دستبوی“ میں غدر کا مفصل ذکر کیا ہے۔ غدر کے دنوں میں غالب گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ غدر میں غالب کی جان اور آبرو محفوظ رہی لیکن مال لٹ گیا۔

غالب نے اپنے مذہب کے متعلق خود اپنے خط بنام علاء الدین خاں علانی میں لکھا ہے

ملاحظہ ہو

”میں موجد خالص ہوں اور مومن کامل ہوں، زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل سے لا موجود الا اللہ اور لا موثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیاء سب واجب التعظیم۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ ختم المرسلین اور رحمتہ العالمین ہیں، مقطع نبوت کا مقطع امامت اور امامت نہ اجتماع بلکہ من اللہ ہے اور عام من اللہ علی علیہ السلام ثم حسن ثم حسین تا مہدی موعود برین زلیست ہم برین بگزم“ (خط ۲۲ بنام علاء الدین خاں علانی خطوط غالب مرتبہ مہر صفحہ ۸۰)

غالب کو حضرت علی علیہ السلام سے والہانہ محبت تھی۔

عاشقم لیکن مدانی کز غرہ بیگانہ ام
ہو شیارم با خدا و با علی دیوانہ ام

غالب نے بارگاہ رسالت میں جو نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے وہ دنیا میں اور آخرت میں ان کے لئے باعث نجات ہے۔

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است
آرے کلام حق بہ زبان محمد است
غالب شنائے خواجہ بہ یزداں گذاشم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است
غالب مذہبی تصنع کے مخالف تھے۔

فرصت اگر ت دست دہد منتقم انکار
ساقی و معنی و شرابے و سرودے
ز نبار ازاں قوم یناشی کہ مرپند
حق را بچودے ونی را بہ درودے
دین کے محتلق غالب کا نظریہ ہے۔

مقصود ما ز دیر و عرم جز جیب نیست
ہر جا کہینم سجدہ بیداں آستاں رسد
کبھی کہتا ہے کہ ہم سے بخشش کا وعدہ بھی ہے اور گناہوں سے منع بھی کیا گیا ہے۔
ہم وعدہ وہم منع ز بخشش چہ حساب است
جان نیست مکرر نتواں داد شرابست

اور کبھی کہتے ہیں کہ زہاد جہاں اصطلاحات میں رہنمائی وجہ سے شش و پنج میں پڑ جاتے ہیں وہاں اہل دل حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں۔

نخور مکافات بہ خلد و سقر آویخت
مشاق عطا شعلہ زگل باز ندانست
غالب کے نزدیک یہ بہشت و دوزخ عوام کو نیکی پر کار بند رکھنے کے لئے ہیں

ہنگامہ دلکش دست نویدم بہ خلد چیت

اندیشہ بے عشق است نیازم بہ بندیت

غالب کے نزدیک ملتیں اگر مٹ جاتی ہیں تو اجر ۲۷ لہاں ہو جاتی ہیں

مائیم ذوق سجدہ چہ مسجد چہ میکدہ

در عشق نیست کفر ز لہان شاختن

غالب کا فارسی کلام نواب ضیاء الدین احمد خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا

جوشی نوکثور نے ان سے حاصل کر کے ۱۸۶۳ء میں اپنے مشہور مطبع میں چھاپا۔

فارسی میں دس ہزار چار سو چوبیس اشعار از قسم ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، قصیدہ،

غزل رباعی کلیات میں جمع کئے گئے ہیں۔ اس میں سید الشہداء کے نوحہ بھی ہیں جس میں سے ایک نوحہ کا مطلع یوں ہے۔

ای فلک شرم از ستم بر خاندان مصطفیٰ

داشتی زین پیش سر آستان مصطفیٰ

دوسرے کا مطلع یوں ہے

اے کج اندیشہ فلک حرمت دین بایستی

علم شاہ نگوں شد نہ چتین بایستی

اور حضرت علی کی شان میں ایک مخمس ہے

در مہد دستبرد بہ اژدر کند علی

رفع نزاع باز و کبوتر کند علی

از جور چرخ پرشش من گر کند علی

زور آزمائی کہ بہ خیر کند علی

دانم ہمان بہ گتبد پیدا کند علی

اس فارسی دیوان میں گیارہ مثنویاں شامل ہیں جو زبان و بیان کے لحاظ سے قابل قدر

ہیں۔ مظہر انصاری صاحب نے ان مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے

ہیں کہ "قطعی مبالغہ نہ ہو گا اگر کہا جائے کہ غزلوں میں یہاں وہاں جو خیالات بکھرے ہوئے ملتے ہیں وہ انثنویوں میں ایک سلسلے اور ترتیب کے ساتھ آئے ہیں۔ ان میں ہمارے شاعر کا پورا وجود، باطنی وجود، خیالات کی رو، زندگی اور فن سے اس کا برتاؤ، تیکھا برتاؤ، آدم زاد اور آدم ساز کے رشتے میں جبر و اختیار کی کش مکش روزمرہ کے مسائل و معاملات میں الجھنے اور سلجھنے کی ضرورت یا مصطلت، فرش پر رہینگے اور عرش پر اڑان بھرنے میں اس کا دم خم ایسے بیان ہوا ہے کہ انثنویوں کے مطالعے میں غالب کی مکمل سخیل شخصیت سے بھرپور تعارف ہو گا اور غالب شناسی ایک قدم آگے بڑھے گی۔" (ثنویات غالب - ظ انصاری - دہلی ۱۹۸۳)۔ "سرمہ بینش" بہادر شاہ ظفر کی مدح میں "چراغ دیر" بنارس کی تعریف میں "باد مخالف" ٹکھتے - والے ہنگامہ کے متعلق "تبرکات" اور "ابر گہر بار" غزوات نبوی کے منظوم تذکرہ کا مقدمہ سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔

سناہما سال "غزوات رسول" نظم کرنے کی فکر میں رہے مگر جب دیکھا کہ موضوع ان کے قابو سے باہر ہوا جا رہا ہے تو اس پر فاتحہ پڑھ دی۔ اس کو غالب کی شاعری کا مزاج اور نقطہ عروج کہنا چاہیے۔ ظ انصاری لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ہے کہ ۱۹ویں صدی کے فارسی شعری خزانہ میں اس سے ابدار گوہر ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ اس خزانہ کا بے مثل جواہر پارہ ہے۔ اپنی ایک ثنوی "درد و غم" میں غالب نے ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ایک بے نصیب کاشتکار تھا جو مفلس تھا اور اس کی ایک بیوی اور لڑکا تھا یہ تینوں عسرت و مصیبت سے پریشان ہو کر نکل پڑے اور بھوک و پیاس کی شدت سے بے چین ہو گئے ان کے پاؤں میں آبد پڑ گئے تھے۔ اور جلد جلنے کی نوبت آگئی تھی یکایک انہیں اس صحرا میں ایک جگہ پر بندوں کا جوم نظر آیا یعنی زندگی کی نشانی ملی اور انہوں نے دیکھا کہ اس سنسان بیابان کے گوشے میں کسی صحرائنشین کا ٹھکانا تھا اور انہوں نے اس درویش سے پانی طلب کیا جب زبان تر ہو گئی تو انہوں نے درویش سے اپنی مراد عرض کی اور تینوں نے اپنا دکھایا بیان کیا اور اس سے استماع کی کہ ان کے لئے دعا کرے۔ وہ درویش صحرائنشین ان کے بیان سے متاثر ہوا اور جب اپنے دل میں ان کے متعلق سوچا تو اس کی آنکھوں کے آگے ان کی تقدیر آگئی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ ان کی قسمت میں سوائے

محرومی کے کچھ نہیں ہے۔ اور ان پر بخشش کا دروازہ بند ہے۔ اس درویش نے پھر بارگاہ خداوندی میں گزرا کر دعا کی کہ ان کو بخش دے اور ان پر رحم کر۔ لیکن بارگاہ خداوندی سے آواز آئی کہ ان کی تقدیر کا جو حال تھا تجھ کو بتلادیا گیا ہے اگر پھر بھی تو کرم کا خواہاں ہے تو ان کو یہ مژدہ سنا دے کہ یہ تینوں مجھ سے ایک ایک تمنا بیان کریں اور یہ تینوں کی صرف ایک ایک تمنا پوری ہوگی۔ اور پھر تم ان دعاؤں کا ماجرہ دیکھنا۔ اور اس مرد بزرگ نے ان سے یہ ماجرہ کہہ سنایا۔ اور کہا کہ جو کچھ تم کو چاہیے مانگ لو۔ وہ لوگ خوش خوش تالیاں بجاتے ہوئے جانے لگے بڑھیا نے جس کا دل ابھی جوان تھا اس نے خیال کیا کہ اگر بوڑھے کے پاس دولت آجائے گی تو عیاشی کرے گا اور مجھے چھوڑ دے گا لہذا اس نے سب سے پہلے دعا کی کہ پروردگار مجھے جوان کر دے اور دنیا بھر کے حسینوں میں امتیاز عطا کر دے۔ اور زلیخا کی طرح میرا شباب لونا دے۔ جیسے ہی اس نے سجدہ سے سر اٹھایا تھا کیا دیکھتی ہے کہ وہ جیسا چاہتی تھی ویسا ہی ہو گیا۔ وہ بالکل مورنی سی بن گئی۔ وہ بوڑھا اس خوبصورت جوان عورت کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا اور گھر کی طرف چلا۔ اور گھر سے کچھ فاصلہ پر اچانک جنگل میں غبار اٹھا اور اقبال مندی کی ہوس ختم ہو گئی۔ اور اس سے ایک شہزادے کا جلوہ ابھرا۔ کسان کی عورت سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اور جب اس نے اپنے پھندے میں کسان کی عورت کو کس لیا تو بیچاری عورت نے اپنا رنگ بدلا۔ اس کے دل سے بوڑھے کسان کی محبت نکل گئی اور وہ اس جوان کی آغوش میں جانے کی ہوس کرنے لگی۔ اور اس نے رونما پیشنا شروع کیا کہ اے نوجوان میری مدد کر میں ان ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہوں۔ اس نوجوان نے اس کی مدد کا ارادہ کیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر چڑھے بٹھالیا۔ اور ہوا ہو گیا۔ بوڑھا حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اور وہ اس کے لئے بدعا کرنے لگا اس نے دعا کی کہ اس کا چہرہ بگاڑ کر اسے سورنی بنا دے۔ ابھی وہ بوڑھا سجدہ سے سر بھی نہ اٹھایا تھا کہ وہ عورت سورنی بن چکی تھی اور شہزادہ اس کو بھوت پرست سمجھ کر خوف سے لرزے لگا۔ اس نے گھوڑے سے دھکا دیکر اسے گر ادیا۔ اور پھر وہ بڑھیا اپنے پیٹے اور شوہر کی طرف دوڑی۔ اور ان کے قدموں پر عاجزی اور خوشامد سے لوٹنے لگی یہاں تک کہ اس کے پیٹے کا دل بھرا آیا اور اس نے بارگاہ خداوندی میں دعا کی کہ اس کی ماں

کو اس کی پہلی حالت پر لومادے۔ اور اس کی دعا مقبول ہوئی پھر وہ عورت وہی بڑھیا بن گئی۔
یہاں پر غالب اس حکایت سے یہ نتیجہ نکالتا ہے۔

غالب اگر محرم معنی شوی
آئینہ پرداز تسلی شوی
تا نمود یاری بخت بلند
چارہ عسی نفتہ سود مند

رحمت حق جوش عطا ہا نمود
رنگ اثر صرف دعا ہا نمود
شد سہ دعا باہمہ لطف اثر
صرف علاج سہ بلائے دگر

یعنی جو تقدیر کا لکھا ہے وہ کسی نہ کسی طرح پورا ہوتا ہے۔

غالب کو لوگ بیدل کا خوشہ چین کہتے ہیں۔ غالب کی جدت پسندی نے فارسی گوئی کے
لئے راہ الگ نکال لی تھی اور فارسی کلیات میں غالب نے بیدل کو ان شعرا میں نہیں گنوا یا جن
سے انہوں نے استفادہ کیا ہے۔

غالب نے اپنے لئے شعر گوئی کے محرکات غمزدگی اور غم دوست قرار دیا ہے سچ تو یہ ہے
کہ اگر غالب کی زندگی میں غم نہ ہوتا تو غالب غالب نہ ہوتے۔ اپنی شنوی "معنی نامہ" میں
لکھتے ہیں کہ مجھے غم نے عقل سکھائی۔ اور غم مجھے بہشت سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں تو ایک
درد مند ہوں تیری سخن سرائی میں غم کے سوا اور کوئی چیز کار فرما نہیں۔

بدانش غم آموز گار من است
غراں عزیز ان بہار من است
غمے کز ازل حد سرشت من است
بعد دوزخ اما بہشت من است

دہم ہجو غالب بہ غم شاد باد
 بدیں شیخ ویرانہ آباد باد
 احساس غم نے غالب کو قنوطیت پسند بنا دیا تھا وہ خود کہتے ہیں کہ احساس غم نے صبح
 وشام کا فرق مٹا دیا ہے۔

نومیدی ما گردش ایام ندارد
 روزے کہ سیہ شد سحر وشام ندارد

روایات کے مطابق غالب نے قصیدہ کو اپنی علمیت اور کمال فن کے اظہار کا بہترین
 آلہ سمجھا۔ چونکہ انہیں اپنی فارسی دانی پر ناز تھا اسی لیے ان کے کلیات فارسی کا ایک بڑا حصہ
 قصیدوں پر مشتمل ہے۔ انہوں نے چوسٹھ قصیدے کہے ہیں۔ ایک حمد میں۔ دو نعتیہ، دس
 حضرت علی اور ائمہ علیہ السلام کی مدح میں ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی اور پندرہ
 قصاید ابو ظفر بہادر شاہ آخری تاجدار دہلی کی مدح میں تین قصائد ملکہ وکنوریہ اور ان کے
 جانشین اور چودہ قصائد۔ انگریزوں کی مدح میں ہیں۔ جس میں سرچارلس مکناف۔ لارڈ
 ہارڈنگ، مسٹر فریزر قابل بیان ہیں۔ سات قصائد دیگر امراسرکار اودھ اور گیارہ قصائد دیگر
 امرا اور نوابین کی مدح میں کہے ہیں۔

قصائد میں فصاحت و بلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مرزا کی چستی اور زبان کی
 برجستگی عقل کو حیران کر دیتی ہے۔ مدح میں قافیہ کا طریقہ جداگانہ دعا کا اسلوب نرالا اور ترتیب
 یوں ہے کہ غالب اپنی تعریف اور ممدوح کی تعریف ہم آہنگ کرتے ہیں۔ عام طور پر ممدوح
 کی بے جا تعریف سے اجتناب کیا ہے۔

غالب کی بلاغت کی ایک اچھی مثال حسب ذیل شعر ہے۔

جنوں محل بہ صحرائے تحیر راند است امشب
 نگہ در چشم وآہم در جگر واماندہ است امشب

معشوق کا خود عشق میں گرفتار ہونا طرفہ تماشا ہے۔ غالب نے اس کیفیت کو اکثر
 مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے۔

شکستہ رنگ تو از عشق خوش تماشا ایست
بہار دہر بہ رنگینی خراں تو نیست
غالب نے اسی مضمون کی اردو میں اس طرح تفسیر کی ہے۔

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جوں جوں کہ اڑتا جائے ہے
رند اگر خدا کی اطاعت نہیں کرتے تو وہ بشرط استواری ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب کی
پرستش میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتے۔

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گراں نہ بود
لیک صنم سجدہ در ناصیہ مشترک بنخواست
چاند اور محبوب کے چہرہ کو تشبیہ عام طور پر دی جاتی ہے لیکن غالب کا طریقہ کچھ اور ہے

چوں بہ سجد کہ نہ آں است بکاہد از شرم
ماہ بچند ببالد کہ جبین تو شود
یعنی ماہ کچھ دن تک بڑھنے کی کوشش کرتا ہے کہ معشوق کے رخ کی برابری کرے مگر
جب کامل ہو کر مقابلہ کرتا ہے تو اپنے آپ کو بے حقیقت پاتا ہے تو شرم سے گھٹنے لگتا ہے۔

معاہدہ بندی ملاحظہ ہو جو واقفیت سے بہت زیادہ قریب ہے۔

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

اور ایک خصوصیت معنی آفرینی ہے۔ اور معنی آفرینی ملاحظہ ہو

خاک کونش خود پسند افتاد در جذب بخود

سجدہ از بہر حرم نگذاشت در سیمائے من

یعنی محبوب کے کوچہ کی خاک میرے سجدہ کو کھینچنے کے لئے اتنی خود پسند واقع ہوئی کہ
میری پیشانی پر سجدہ کے لئے بھی جگہ نہیں چھوڑی۔

شب فراق کے متعلق کہتے ہیں

شب فراق ندارد سحر و لے پچکند
یہ گفتگوئے سحر میتوال فریفت مرا
غالب کہتے ہیں کہ کرم بہانہ جو ہے بخشش کے لیے وہ عمل کو نہیں دیکھتا۔
بہانہ جو ست کرم زان گذارش کار
بنودہ حسن عمل را علاقہ توفیق
غالب ناکردہ گناہوں کے بھی حسرت کی دادیوں طلب کرتے ہیں
اندر اس روز کہ پرشش رود از ہرچہ گذشت
کاش باما سخن از حسرت مایز کند

غالب کی فکر میں رسائی اور بلندی تخیل موجود تھی۔ فارسی زبان کے الفاظ اور محاوروں پر انہیں کامل عبور تھا۔ اور وہ اپنا کمال بھی دکھلانا چاہتے تھے۔ اور جدت و اچھوتا پن بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ غالب نے قافیہ استعمال کی ضرورت سے بھی شعر پیدا کیا ہے۔ بعض غزلوں میں اعمال و احوال کے قوافی لگتے ہیں۔ غالب کا تخیل روایات کی حد بندیوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ اظہار خیال کے لئے راہ الگ نکال لیتے ہیں۔ غالب چاہ زخندان کے متعلق ایک شعریوں کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص چاہ میں گر جاتا ہے تو غل مچاتا ہے۔ اسی طرح ذلت نے منہ پر اندھیرا کر رکھا ہے اور دل راہرو کی مانند چاہ زخندان میں گر جاتا ہے تو فریاد کرتا ہے۔

غروش و زاری من در سیاہی شب زلف

دم فتادن دل درچہ ذقن یاد آر

ایران میں غالب کو فارسی زبان کا شاعر ہی نہیں مانا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ ایرانی غالب کے فارسی کلام کو پڑھنے لگے اور اس کے فکر و فن کو سمجھنے لگے لیکن آج بھی غالب کو ہندوستان میں شاعری کے لحاظ سے جو درجہ حاصل ہے وہ ایران میں نہیں۔



نہیں فرار داروں کے

پروین اخصائی

پروین اعتصامی شعر کے آئینہ میں

کسی شاعر کی شاعری کو سمجھنے سے پہلے اسکے زمانہ کے حالات اور عوامیات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ پروین دور مشروطیت کی شاعر ہے تو ہمیں اسکے اشعار کو پڑھنے سے پہلے اس کے زمانہ کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس وقت ایران میں انتشار پھیلا ہوا تھا۔ ناصر الدین شاہ کی مطلق العنانی برطانوی سامراجیوں کی ٹھیکہ داروں کے بڑھتے ہوئے نفوذ نے ملک میں ہر طرف افلاس بیروزگاری اور غربت کو پھیلا دیا تھا۔ لوگوں میں خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ میں شدید بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری طرف کچھ منصوبوں کے قیام اور ٹیکسٹائل لائین، ریلوے اور پریس کی توسیع اور سائنسی علوم سے تعارف ایرانی سماج میں ایک طبقہ کو بیدار کر رہا تھا اور لازماً اس نئے طبقہ کے ساتھ نیا جمہوری شعور بھی ابھر رہا تھا۔ وطن دوستی اور اپنی ذلت کا احساس ذہنوں کو چوڑھا رہا تھا۔ اس وقت کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے دلوں میں دہی دہی اس چنگاری کو شعلہ بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ انھوں نے اپنے وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور دوسروں کو بھی اس کا احساس دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن کچھ لوگوں نے اپنے دور کے ہنگاموں سے ڈر کر چمکے مرکز دیکھنا شروع کیا اور قدما کے طرز کو اپنی شاعری کی بنیاد بنا ڈالا۔ مثلاً فتح علی خاں صبا، لطف علی آذر، قائم مقام، سروش، شہاب، قآنی وغیرہ لیکن جہاں تک Content کا سوال ہے اس میں بہت کچھ نیا پن تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی دوسری طرف ایسے لکھنے والے پیدا ہوتے جنکی نظر زیادہ وسیع تھی جن کے حوصلے زیادہ بلند تھے جن میں زیادہ جرات تھی انہوں نے افراتفری کی سیاہ رات کے بیچ میں مستقبل کی روشنیوں کو دیکھا اور اپنے قلم کے ذریعہ امید کی روشن کرنوں کو عوام کے دلوں تک پہنچایا۔ ان کو ہم فارسی کی جدید شاعری کے بانیوں اور معماروں میں شمار کر سکتے ہیں۔

پروین اعتصامی کا نام ایران کی افق شاعری پر اسی زمانے میں نمودار ہوا اس کی زندگی بھی مختصر تھی اور کلام بھی مختصر۔ لیکن جتنا کلام ہمیں ملتا ہے اس میں ہمیں ایرانی عوام کے لئے

واقعی پر خلوص جذبہ ہمدردی ملتا ہے۔ پروین کے والد اعتصام الدولہ خود ایک اچھے شاعر و مترجم تھے اور پروین نے انہیں سے تعلیم و تربیت پائی۔ رضا خاں کی تخت نشینی کے وقت وہ صرف دس سال کی تھی اور ۳۵ سال کی عمر میں اس کی عمر کا ہیما نہ لبریز ہو گیا۔

اسماعیل حاکی صاحب اپنی کتاب ادبیات معاصر کے صفحہ ۲۷ پر پروین کے متعلق یوں رقم طراز ہیں۔

”پروین دختر مترجم و نویندہ دانشمند مرحوم یوسف اعتصامی (اعتصام الملک) بود از کودکی استعداد شاعری او آشکار شد و با آنکہ زندگیش زود بہ سر آمد در ہمان جوانی در شاعری شہرت یافت۔ سی و پنج سال عمر او ہمراہ با افسردگی ہا و اندوہ بسیار گذشت۔ زبان پروین بہ زبان شاعران کہن از قبیل: منوچہری، ناصر جہز، سعدی، مولوی و حافظ نزدیک است۔ وی در اشعار خود از تمثیل و حکایت و قصہ بسیار استفادہ کردہ است۔ پروین در سال ۱۳۲۰ شمسی در گذشت و در قہم بہ خاک سپردہ شد“

پروین کا مزار قہم میں امام رضا علیہ السلام کی بہن حضرت فاطمہ جہنیں معصومہ قہم کہا جاتا ہے ان کے روضہ کے صحن میں اپنے باپ کے پہلو میں دفن ہے۔ جناب ڈاکٹر ابو القاسم رادفر صاحب اپنے ایک مقالہ ”گنج حقیقت نگاہی بہ شعرو اندیشہ پروین و کتاب شامی او“ میں جو قند پارسی کے شمارہ ہشتم میں چھپا ہے پروین سے متعلق اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

”سخن از پروین ستارہ در خشاں شعر آسمان ادب ایران است۔ شاعری درد آشا انا صبور، باشعری سادہ و بی ریا و در عین حال عمیق، در خدمت مردم زمانہ اش پروین زنی بود کہ مردانہ بہ پانخواست و شعر خود را بچوں سلامی بران در مبارزہ باد غلکاران و ستمکاران و ہمہ مصائب بشری بہ کار برد“

اور آگے لکھتے ہیں کہ وہ تبریز میں پیدا ہوئی اور تہران کے امریکن کالج میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸ سال کے سن میں اس کالج سے فارغ التحصیل ہوئی۔ ازدولہی زندگی میں اس کو شکست ہوئی اور اسی ناکامی کی وجہ سے بستر مرگ سے لگ گئی اور ۳۵ سال کی عمر میں اس جہاں سے سفر

کیا۔ اس کی زندگی نشیب و فراز سے پر تھی ایک طرف تو سیاسی اور اجتماعی حالات اور دوسری طرف مالی اور اخلاقی حالات نے اس کے درد مند دل کو بہت رنجیدہ کر دیا۔ یہ زمانہ آزادی خواہوں اور روشن فکروں کے لئے تنگ ہو گیا تھا۔ کیونکہ ذرا سی بھی تحریک کی جاتی یا جنبش ہوتی تو بری طرح حکومت کی طرف سے سرکوبی کی جاتی تھی۔ اس دور میں بعض اہل قلم کو قید کی صعوبتیں اٹھانا پڑا بعض لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور کچھ نے مثل لاہوتی راہ فرار اختیار کی پروین نے جب خود میں حکومت کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ پائی تو مناظرہ کے قالب میں اور تمثیلی طور پر اپنے اشعار میں خیالات کا اظہار کیا۔ پروین نے ایران کی روایتی شاعری کو مغرب کے قلب میں ڈھالا اور ایک نیا طرز پیدا کیا۔ انہوں نے انسانی فکروں اور سملجی حالات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ پروین نے اپنے احساس غور و فکر کو بلند خیالی اور نرم و ہموار زبان میں عوام کے سامنے پیش کیا۔ اور اپنے اشعار میں تمثیل کے طور پر اخلاقی و سملجی مسائل کو پیش کیا۔ پروین کی نظرتیز اور محققانہ تھی اس نے اپنے مضامین و موضوع کے انتخاب میں اخلاق، اصلاح و بہبودی عوام کو ترجیح دی۔

محمد اسحاق ندائی اپنی کتاب ”ادبیات نوین ایران“ ترجمہ و گردآوری یعقوب آرژند کہ صفحہ ۱۸۔۔ تہران ۱۳۶۳ ف میں لکھتے ہیں:

”بانیکہ باید پذیرفت کہ او در بعضی از این اشعار مناظرہ ای موفق است ولی بقیہ اشعار مناظرہ ای او کسل کنندہ و خشکی زاست۔“

ڈاکٹر ابوالقاسم راہوف اپنے متذکرہ بالا مضمون کے صفحہ ۱۹۷ میں شعر پروین سے متعلق

اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں۔

شعر پروین آمیزہ ای از معارف عرفانی و آموزش ہای اخلاقی و برگرفته از تعالیم قرآنی و احادیث ائمہ (علیہم السلام) است۔ شعر او پیوند ذہنیت و وطنیت است او ارزش حافی انسانی را در شعر مطرح می کند و راہ اصلاح جامع را از اندر زہای اخلاقی می داند۔ او شاعری واقع بین و خرد گر است۔ شعر او نتیجہ گرہ خوردنی اندیشہ والا و گذشتہ و حال است کہ متضمن بیان مسوولیت حافی

اجتماعی عصر و زمان شاعر نیز می باشد۔

وہ خدا بھی مقدمہ دیوان پروین چاپ تہران ۱۳۱۴ھ میں پروین کے اشعار کو سلیس و متین و ہم شان شعر استادان قدیم سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ پروین کے اشعار سوز و دروں رکھتے ہیں اور عوام و انسانی درد کو شعر میں پیش کرتی ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پروین کے خیالات جو متعلق بیان کئے ہیں وہ اس کا تجزیہ نہیں ہے لیکن اس نے افلاس۔ فقر اور رنج کا مزہ نہیں چکھا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق دولت مند طبقہ سے تھا۔ اور اس کے اشعار صرف فرانسیسی نالوں و ہیکل ہنگو کے اثر کے تحت ہے۔

پروین نے اپنے اشعار میں ایرانی عورتوں کی زبوں حالی کو بیان کیا ہے اور اپنے زمانے کی سماجی و اقتصادی حالات کی یہ تصویر کشی کی ہے۔ اس کے اشعار میں ایران کی عورتوں کے دل کی دھڑکن پائی جاتی ہے۔ وہ عورتوں میں بیداری کی قائل ہے۔

ڈاکٹر سید تقی علی عابدی اپنی کتاب جدید فارسی شاعری کے صفحہ ۱۸۶ پر جو ان کا پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اور لکھنؤ سے ۱۹۸۸ء میں چھپا ہے اس طرح لکھتے ہیں:-

”پروین اعتصامی کا نام جدید فارسی شاعری کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھا جاتا ہے۔ ان کی ادبی جد و جہد ایسے زمانہ میں شروع ہوئی جب شاعری تین طبقوں میں بٹ چکی تھی۔ پہلی قسم کی شاعری روایتی انداز کی شاعری تھی۔ یعنی جس میں محاصر شعراء نے کلاسیکی انداز بیان کی پیروی کی (خواہ وہ طرز خراسانی ہو، عراقی ہو یا ہندی) دوسری قسم کی شاعری وہ تھی جس میں قدیم روایتی شاعری کے قواعد و اوزان و قافیہ سے رشتہ توڑے بغیر فقط لفظی اور معنوی تبدیلی کی گئی تاکہ وہ وقت کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو سکے۔ اس قسم کی شاعری کو عہد جمہوریت کی شاعری بھی کہا جاسکتا ہے اس کے بعد تیسری قسم کی شاعری کے بانی نیما یوشیج ہیں۔ بہر حال پروین اعتصامی نے دوسری قسم کی شاعری کو اختیار کیا۔ ان کی شاعری شکل کے اعتبار سے کلاسیکی پیرایہ بیان کی اور معنی کے اعتبار سے جدید رجحانات کی حامل ہے۔

کیوں کہ انہوں نے وزن و قافیہ سے رشتہ توڑے بغیر فقط لفظی و معنوی تبدیلی کی۔ اس تبدیلی کے ساتھ انہوں نے اپنے اشعار میں سملتی حالات کے نشیب و فراز کا مکمل احاطہ کیا۔ ان کی شاعری کا مرکزی خیال بے انصافی سے نفرت و بیزاری اور حق و سچائی سے الفت و محبت ہے۔ انہوں نے اپنی بات کو چھوٹی چھوٹی مثالوں کے ذریعہ بتایا۔ اور ان ہی کے ذریعہ انسانی، اخلاقی اور سملتی حل تلاش کئے۔“

ڈاکٹر رضیہ اکبر صاحبہ کا خیال ہے کہ پروین اپنے بہت سے اشعار میں ایک مادر مہربان کی طرح اپنے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ پروین حق کی مستلشی ہے۔ اس وجہ سے زندگی کی تظیوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتی ہے اور بہت ہی خاص مہارت کے ساتھ اپنے پڑھنے والے کو اس کی نشان دہی کرتی ہے۔ علم و ہنر کو پروین ہر چیز پر ترجیح دیتی ہے اور لوگوں کو علم حاصل کرنے کی اس طرح اپنے اشعار میں ترغیب دیتی ہے۔

گویند عارفان ہنر و علم کییاست
وآن میں کہ گشت ہمہ ایں کییا طلاست
وقت کی قدر کرنا سکھاتی ہے؟

وقت گذشتہ را نتوانی خرید باز
مفروش خیرہ ، کاین گہر پاک بی بہاست

زہد کہ متعلق کہتی ہیں:-

زہد بہ نیست پاک است نہ بہ جامہ پاک
اتی سن آلودہ کہ پاکیزہ ردائی دارد

پروین اپنی ایک نظم ”گوہر اشک“ میں امیری و غربی کا فرق بتلاتی ہیں:

آن نشیندند کہ یک قطرہ اشک
مجدم از چشم یتیمی چکید

برد بسی رنج نشیب و فراز
 گاہ در افتاد وزمانی دوید
 گاہ درخشید و گہی تیرہ ماند
 گاہ نہاں شد و گہی شد پدید
 عاقبت افتاد بدامان خاک
 سرخ نگینی بسر راہ دید
 گفت کہ پیشہ و نام تو چیست
 گفت مرا با تو چہ گفت و شنید
 من گھر ناب و تو اک قطرہ آب
 من زازل تو ست و پلید
 دوست نگر دید فقیر و غنی
 یار نباشد شقی و سعید

پروین لوگوں کو عمل کی دعوت دیتی ہے تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھ رہنے سے منع کرتی ہے۔

کار خود را ہمہ بادست تو کرد
 نفس جز دست تو افزار نہ داشت

وہ کہتی ہے کہ آج کی لڑکی کل کی ماں بن جائے گی اور اس کی اولاد سے اس کا رتبہ بلند ہوگا وہ عورت کی عظمت کو بتلاتی ہے اور اپنی نظم مرد و زن میں کہتی ہے کہ ایک کشتی ہے اور دوسرا ملاح ہے اگر ملاح عقل مند نہ ہو تو کشتی ڈوب جائے گی۔
 اور کبھی کہتی ہیں کہ جس گھر میں عورت نہ ہو اس گھر میں شفقت و محبت نام کی کوئی چیز نہیں۔

در آن سرای کہ زن نیست انس و شفقت نیست

در آن وجود کہ دل مرد ، مردہ است روان

پروین نے پردہ سے متعلق ایک نظم ”زن در ایران“ کے نام سے لکھی جس کے ذریعہ

بتایا کہ سادگی، پاک اور پرہیزگاری عورت کے زیور ہیں۔

سادگی و پاک و پرہیز یک یک گوہرند
گوہر تابندہ باتہا گوہر کافی بنود

پروین کے اشعار اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ انہوں نے ایرانی حکومت اور ہمناموں پر طنز کیا ہے اور دوست دشمن کی پہچان اور پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ سے جاہدہ کو ملت فروشی سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے کمزور اور مزدور طبقہ کی ہمدردی بھی کی ہے۔ اس کے متعلق نظم ”سہ قطرہ خون“ لکھا ہے۔ پروین نے ”اشک یتیم“ کے نام سے ایک کتاب بھی خوبصورت نظم لکھی جو سامعین کے ملاحظہ کے لئے پیش کر رہی ہوں۔

روزی گذشت پا دہشی از گذرگھی
فریاد شوق بر سر ہر کوئی وبام خاست

پرسید زان میاں یکی کودک و یتیم
کاین تابناک چیت کہ بر تاج بادشاہت

آن یک جواب دادا کہ دانیم ما کہ چیت
پیدا است آنقدر کہ متاعی گرا بخامت

نزدیک رفت پیر زنی کوڑ پشت و گفت
این اشک دیدہ من و خون دل شما است

غرض یہ کہ پروین کے کلام میں سادگی سلاست اور روانی کے ساتھ اخلاقی، اصلاحی و پسند
یز مضامین بصورت تمثیل پائے جاتے ہیں اور ان کے کلام میں بہت دلکشی بھی ہے گہرائی اور
یرائی بھی

پروین نے عورت کو اپنی شاعری کا موضوع تو بنایا مگر نئے انداز سے کیوں کہ وہ مغربی
ب سے روشناس تھی جس میں صرف حسن و عشق کا میدان ہی نہیں بلکہ قدرتی مناظر کے

ساتھ ساتھ مذہب، سیاست، سماج، حب وطن اور عورت کی کاروباری زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ اور اس طرح عورت کو عمل کا پیغام دیا۔ اور عورت کو ملک و قوم کا ایک اہم رکن مانا۔ جس کے کندھوں پر ملک و قوم کی ذمہ داری ہے۔ وہ اگر چاہے تو ملک و قوم کی عزت و آبرو کو دوبالا کر دے اور اگر چاہے تو صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ انہوں نے اپنی مشہور نظم ”فرشتہ انس“ میں اس بات کا اظہار کیا ہے۔ دوسرے جدید شعراء کی طرح پروین بھی قسمت کی قائل نظر نہیں آتی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ قسمت انسان کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے قسمت پر قناعت کرنے والوں پر طنز کرتے ہوئے کہا:

دیوانگی است قصہ تقدیر و بخت نیست

از بام سرنگوں شدن و گفتن این قضاست

پروین نے اپنی ایک نظم ”تخت بی بر“ میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ اگر بغیر پھل کا درخت ہو تو اس کی قسمت میں ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ تیرد درخت کے مکالمہ کی صورت میں ایک تمثیل پیش کی گئی ہے۔ انجام کار درخت کو کاٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔ اور شعلہ و لکڑی کا مکالمہ اس طرح بیان کیا ہے:

خندید بر اوشعلہ کہ : از دست کہ نائی

ناچیزی تو کرد بدین گو نہ تورا خوار

آن شاخ کہ سر بہ کشد و میوہ نیارد

فرجام بہ جز سوختن است سزاوار

جز دانش و حکمت نبود میوہ انسان

ای میوہ فروش ہنر ! این دکہ بازار

از گفتہ ناکردہ بہودہ چہ حاصل

کرد انکو کن ، کہ نہ سودی از گفتار

پروین کہتی ہے کہ جو درخت میوہ نہ رکھے اور غرور کرے تو اس کو جلا دینا ہی بہتر ہے۔ انسان کے لیے سوائے دانش و حکمت کے کوئی چیز بہتر نہیں۔ اے ہنر فروش اس بازار میں سوائے

کردار نیک کہ کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی بیکار یہودہ باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ ہنر پیدا کرے اور کام کرے تو ضرور اس کو فائدہ پہنچے گا۔

پروین اپنی ایک اور نظم ہنر و علم میں کہتی ہے کہ ہنر و علم کیمیا ہے اور جو بھی اس سے مس ہوتا ہے سونا بن جاتا ہے۔ اور کہتی ہے کہ وقت گزشتہ کو تو دوبارہ نہیں پاسکتا یہ ایک بیش بہا گہر ہے تن پروری سے منع کرتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ انسان کی دولت فضیلت سے ہے۔ اور ایسے آدمی سے ڈرو جو شیطان کا دوست ہے۔ اور کہتی ہے کہ۔

آن را کہ دیبہ ہنر و علم در برست

فرش سرای اوچہ غم ارز آنکہ بوریاست

جس آدمی کے پہلو میں علم و ہنر ہے اگر وہ بوریہ پر بیٹھا ہو تو کوئی غم نہیں۔ بلندی و پستی تو علم کی فضیلت سے ہے۔

پروین کے آثار میں دیوان پروین ہے۔ حسب ذیل میں قصیدہ، ثنویات اور نظمیں

ہیں۔ کلیات دیوان ہے جس میں قطعات منتخب نظمیں اور چند اشعار ہیں۔

علی دہباشی نے پروین کے نظموں کا انتخاب ۱۳۸۸ھ میں تہران میں چھاپا ہے جو ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

م نور بخش نے اصفہان سے ۲۲۹ صفحہ پر مشتمل ایک انتخاب قطعات پروین شائع کیا ہے جو ۳۴۳ شمسی میں چھپی

۳۲ صفحات پر مشتمل ایک دیوان شعر پروین کے نام سے کتاب چھپی ہے جوش وزیری نے ۱۳۱۳ شمسی میں چھاپا ہے اور ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے یہ تہران سے چھپی ہے۔

مقدمہ اور سپاسنامی کے ساتھ حشمت موید نے شکاگو سے ”دیوان پروین اعتصامی“ منتشر کیا ہے۔

ابوالفتح اعتصامی نے تہران سے ایک دیوان پروین اعتصامی شائع کیا ہے جو ۳۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

دیوان قصاید و ثنویات گب سوسائٹی سے وزیری نے ۳۴۲ صفحات پر چاپ کیا ہے۔

میروی نے، دیوان قصاید، ثنویات و تمثیلات و مقطعات خانم پروین اعتصامی ۲۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ عباس رجبی نے "گل چینی از دیوان پروین اعتصامی" کے نام سے پاکٹ سائز کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل منتشر کی ہے۔ اور اسی عنوان سے یعقوب پیری نے ایک انتخاب تہران سے ۲۴۰ صفحات پر منتشر کیا ہے۔

ادبیات انقلاب اسلامی کی جھلکیاں

ڈاکٹر ابو القاسم رادفر

ترجمہ ڈاکٹر زینب حیدر

ایران میں ادب انقلابی ایک خاص خصوصیت کے ساتھ ظاہر ہوا اور پھیلا اور ایک انقلابی عمل کی طرف رجوع بکا رہے۔ بغیر کسی جھجک کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی پیدائش کے محرکات، وسعت و رنگارنگی مختلف تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انقلاب اسلامی کی سیاسی اور سملی بنیادوں پر کاربند ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انقلابیوں نے ترقی کی اور اپنی مشکلات سے پر زندگی کو فراموش کر کے ادب کے مختلف میدانوں میں تحقیق شروع کی شاید ان میں سے ایک اہم ترین بات اپنے ملک کے تمدن کی طرف رغبت اور غیر ملکی تمدن سے دوری انقلابی ادب و فن کی خصوصیت ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس ملک کے انقلابات اور تغیرات فنی اور ادبی لحاظ سے ایک دوسرے کے قدم بہ قدم اور ساتھ ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ہر انقلاب کے لئے فن کی نمائش پروپگنڈہ کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

اگر مبالغہ سے کام نہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر اوقات ایسے بڑے حادثات و اتفاقات بغیر فن اور ادب کی مدد کے وجود میں نہیں آسکتے۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایسے اتفاقات کا وجود میں آنا بہت مشکل ہے۔

ایران کی تاریخ کا بڑا حصہ اس بات کا گواہ ہے کہ شعر و موسیقی انسانوں کے دلوں میں بیجان انگیز انقلاب اور تغیر پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ رہے ہیں اور اس کا دوسری اقوام پر بھی ایسا ہی

اثر ہوتا ہے۔ اس لئے باوجود ابتدائی شکل میں ہونے اور نامکمل ہونے کے ادبیات اسلامی انقلاب کی نشر و اشاعت کا سب سے بڑا اور جاذب ترین وسیلہ ہے۔

ایک طرز فکر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ ہر تمدن و تہذیب کی بقا اور سلامتی و نفوذ و اشاعت فن کے قالب میں ہوتی ہے۔ خصوصاً ادبیات وہ بھی شعر حقیقت میں کسی سماج کے افراد پر اثر انداز ہونے اور اپنے پیام کو پہنچانے کا بڑا ذریعہ ہے۔

مذکورہ بالا مختصر تمہید کے ساتھ ہی میں ایک طرف تو ادبیات انقلاب کی اشاعت پر روشنی ڈالوں گا تو دوسری طرف اپنے مقالہ کے حجم کو کم رکھتے ہوئے اپنے مطلب کو پورا کرنے اور مقالہ کو وقت پر ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں اپنے مقالہ میں ادبیات انقلاب ایران کی عمدہ خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسری چند باتوں کا جو اس سے متعلق ہیں جیسے تحفظ اور دور جنگ کے ادب کا ذکر محدود کروں گا۔ اور تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے چند نمونے پیش کروں گا۔ میرے لئے اصل حوالوں کی (حیدر آباد میں) کمی اور اصل مواد سے ناآشنائی اس وقت ایک مسئلہ ہے۔ فی الحال ان سب باتوں سے گریز کرتے ہوئے اپنے مطلب کی طرف آ رہا ہوں۔

جہاں کہیں بھی انقلاب اور تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں یہ مکمل خود آگہی۔ تمدن کی تبدیلی اور فکر کی توانائی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یقیناً انقلاب اسلامی ایران کی وجہ سے تجدید حیات کے علاوہ انسانوں اور اسلام کی اہمیت، خودی کی پہچان اور بیرونی چیزوں کا بائیکاٹ ہوا۔ اور یہی مسائل ادبیات انقلاب کی نظم و نثر کی پیدائش کا موجب بنے اور خلاصہ فکر و احساس کے رد عمل کے طور پر تمام سماج کے ذہنوں پر چھل گئے۔

بیشک اعلیٰ فکر اور گہرے و پاک احساسات نظم و نثر کے قالب میں فن و ادب کی شکل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں انقلاب اسلامی کے بعد عوام کی بے چینی اور اضطراب کی وجہ سے ادبیات فارسی میں کمی و بیشی کے لحاظ سے خصوصاً ایسی نظم پیدا ہوئی جن میں سیاسی اور سماجی طور پر انقلاب کے دوران اور اس کے بعد جنگ تحمیلی کے موقع پر آٹھ سال کی مدت تک

شاعروں اور ہنرمندوں نے بہت سی تخلیقات کیں۔ ان کے بعض مضامین میں اس صدی کے عوام کا درد و خواہشات، غصہ و غم، نکتہ چینی و فریاد اخون و آگ، درد مند اور درد آشا عوام کے جذبات، ستم دیدہ اور ظلم رسیدہ لوگوں کی فریاد کا حال ملتا ہے۔

انقلاب اسلامی کے ادبیات میں عام طور پر ہر نوع سخن میں سخن پرداز کی گئی ہے۔ اور انقلاب اور اس کے مسائل میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس کے معنی عوام کے جذبات کے آئینہ دار ہیں جس کو شاعروں اور ادیبوں نے جو ان ہی ستم رسیدہ اور غم نصیب عوام میں سے اٹھے ہیں عوام کے جذبات، احساسات و خواہشات کی اپنی نظم و نثر میں تصویر کشی کی ہے اور ان کے اعتراضوں اور فریاد کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

جیسا کہ ادب ہمیشہ انسانوں خاص طور پر فنکاروں کو اس بات کی طرف راغب کرتا ہے کہ اپنے عوام کے مسائل پر نگاہ کریں اور یہ بات بالکل فطری ہے کہ یہ سب ہنگامہ، حرکت اور قربانی و شہادت صرف انقلاب کے لئے ہیں۔ اس سے پہلے عوام نے جنگ آزمائی نہیں کی۔ فنی طور پر شاعر و ادیب اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ لحاظ قواعد وہ ابھی کمزور ہیں۔

خصوصیات ادبیات انقلاب اسلامی

۱۔ اس دور کی ادبیات کی ایک بڑی اہم خصوصیت سہل حال کا بیان اور عام آدمی کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اس بنیاد پر شاعر اور ادیب کا فرض بنتا ہے کہ وہ عوام کے درد، مصیبت اور ان کی محرومیوں کو بیان کرے۔

۲۔ دوسری خصوصیت غلامی اور حکمرانی سے انسانوں کو چھٹکارا دلانے کے مختلف طریقے تلاش کرنا ہے۔ کیونکہ انقلاب اسلام سے قبل ایرانی عوام مغربی تمدن اور استعمال سے متاثر تھے اور زیادہ تر مادی انحطاط کی طرف متوجہ تھے۔

۳۔ حاکموں اور عہدہ داروں اور اجارہ داروں سے عوام کو چھٹکارا دلانا بھی اس دور کا اہم موضوع ہے۔ کیونکہ یہ ادب عوام کا ہے اور عوام کے لئے ہے اور ان کے مسائل کو بیان کرتا

ہے۔ تفسنی اور روشن فکروں کا ادب اس بات سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح اس میں نفسانی خواہشات اور اسی طرح کے خیالات بھی نہیں ہیں اور شاعر و مصنف خود اپنے اظہار خیال اور سب کی خواہش کے لئے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ بلکہ یہ نشان دہی کرتی ہے کہ شاعروں اور لکھنے والوں کا غصہ ان ہی کے ایک گروہ سے اٹھا اور دھکتے ہوئے تنور کی گرمی میں صیقل ہوا اور وہ جو ایک نیا خیال رکھتے ہیں ان کا مقصد انسانی اقدار کی اہمیت و اسلامی تعلیمات کی طرف توجہ ہے۔

۴۔ انقلابی شعر و ادب کی ایک بہت عمدہ خصوصیت خدا خواہی اور خدا شاسی ہے۔ ادبیات انقلاب اسلامی اس بات کی طرف متوجہ ہے کہ کس طرح انسان سوئے کبریا رجوع ہو۔ ہمارے ملک میں اس طرح کا ادب ہر چیز کا محور خدا کو سمجھتا ہے اور سچائی کو اس کا ایک محرک اصلی جانتا ہے۔

۵۔ ادبیات انقلاب کی اور ایک جھلک انسان کو اہمیت دینا ہے کیونکہ قرآن کی آیتوں کے مصداق انسان خدا کا نائب یا خلیفہ ہے۔ اسی لئے انسانی روح کو بہت اہمیت دینی چاہیے۔ یہ سچ ہے کہ ادبیات انقلاب نے عوام کے مسائل کو سلجھانے کی طرف بہت توجہ کی ہے لیکن صرف اپنی ذات کی پہچان ہی کافی نہیں ہے بلکہ عوام کی موجودہ حالت میں تغیر و تبدیلی لانی جانا چاہیے

۶۔ ادبیات انقلاب کی ایک اور خصوصیت اپنی ہی طرف بازگشت ہے اور اہمیت اسلام ہے۔ اسی لئے عوام کی لڑائی میں شرکت انقلاب کا ثمر ہے، عوام کی روح کو بیدار کرنا اور اسلام کی طرف رغب کرنا ہے۔ اس تبدیلی کے ساتھ بہت سی توقعات اور امیدیں وابستہ ہیں۔

ان انقلابی ادیبوں اور شاعروں کی تبدیلی کی بنیادی تلاش اہمیت انقلاب کو خود اپنے آپ میں ظاہر کرنا ہے اور اس کا سب سے اچھا محور و مظہر اپنے خود کی طرف رجوع ہونا اور سیر الی اللہ اور روح انسانی کی ترقی ہے۔

۷۔ آیات قرآنی سے فائدہ اٹھا کر مختلف طریقوں سے عوام کے ذہنوں میں اہمیت ادبیات

انقلاب اسلامی کو اجاگر کرنا ہے سہناچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ تر یہ قرآن وحدیث اور تصوف اسلامی سے مملو ہے اور قرآنی مضامین سے بھرپور ہے۔ ادب انقلاب میں اسلامی اثر کے نتیجہ کے طور پر اس دور کے شاعر کا ذہن جہاں اپنی یعنی سارا جہاں ہمارا، کا تصور رکھتا ہے۔ اس جگہ شاعر اجارہ داری کی بات خدا سے کہتا ہے اور وہ عوام کو چھٹکارہ دلانا چاہتا ہے اور ان سے ہمدردی اور ٹھنڈے دل سے ان کے معاملات پر غور کرتا ہے اس دور کی شاعری میں ہم اس قسم کے خیالات دیکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبیات انقلاب وہ چیز ہے جو امید اور حرکت کو ایجاد کرتی ہے اور یاس اور ناامیدی کو دل سے زائل کرتی ہے۔

۸۔ ظلم کے خلاف لڑائی اور جبر و ستم سے تیز ادبیات انقلاب کی ایک خصوصیت ہے۔ اس دور کے شاعر کا قلم تمام عوام کی طرف متوجہ ہے جو کہ لوگوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ پیسہ و طاقت کی بناء پر لوگوں کا استحصال کرنے والے دنیاوی طاقت، دولت اور جھوٹی شہرت کی بناء پر جو دانشمند اپنی فکر کی توانائیوں کو تباہ کر چکے تھے وہ اب ایسے عوام کے طرفدار ہو گئے جو کمزور اور مظلوم تھے۔ البتہ یہ اونچے نظریات، ہمیں عہد گزشتہ کے تاریک اشعار میں نظر آتے ہیں جو بہت ہی شدت اور وسیع طور پر دورہ مشروطیت اور دوسرے ادوار میں دیکھے جاسکتے ہیں اور جو آہستہ آہستہ بے رنگ ہوتے گئے۔

۹۔ انقلابی ادب کی ایک اور خصوصیت طنز ہے۔ انقلابی دور کے شاعر اور فنکار اپنے شعر و ادب میں طنز سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور عوام کی مشکلات و نزاعی معاملات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی لئے انقلابی عہد کا طنز نویس اور فنکار عوام کے مسائل کے بیان تک اپنے کو محدود نہیں کرتا بلکہ طنز اور تنقید کا نشانہ تمام دنیا داروں، عالموں، انسانوں کی بد نصیبی، درد اور مجبوری کے بیان کو بناتا ہے۔ ہمارے عہد کے طنز نویس کی غصہ سے بھرپور نظر کا تیر تمام طنز نویسوں کی طرح انسانوں کی زخم خوردگی، درد، محرومی اور ستم کشی کی تاریخ کی طرف جاتا ہے

۱۰۔ زبان اور طرز بیان کے تغیر کو ادبیات انقلاب کا سب سے اہم صوری تغیر سمجھا جاتا

چلے۔ پھر بھی اہمیت قرآنی اور انقلاب، اور خود کی طرف بازگشت اور خدائے تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا حقیقت میں جدید ادب کا تازہ معیار ہے۔ یہاں شعر کے پرانے قالب میں نئے مضامین سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ کچھ ایسے قدیم اقدار جو بھلائے جا چکے تھے پھر سے ایک نئے طریقہ سے استعمال ہونے لگے۔ آج کے شاعروں کی توجہ قافیہ پر پہلے سے زیادہ ہونے لگی۔ شعر انقلاب کے موضوع شعر گزشتہ سے بہت فرق رکھتے ہیں اور ان کی سب سے عمدہ خصوصیت دینی رنگ اور تشبیہات و استعارات اور دوسری صنعتیں ہیں۔ اسی طرح تلخیصات، تفسیم، آیات اور احادیث کا اقتباس اور اسلامی داستانوں کی طرف اشارے جو ایک زمانہ تک اشعار میں محدود اور اکثر معدوم ہو گئے تھے وہ انقلاب کے بعد کے ادب کی ایک خاص خصوصیت میں سے ایک ہے۔ اسی طرح لبہام اور پیچیدگیوں کا کم ہونا (بجز چند سبک ہندی کی طرف راغب شاعروں) کے خصوصیت شعر شاعرانہ انقلاب سمجھی جاتی ہے۔ شعر انقلاب کے ادب کی خصوصیات پر اگر ہم نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ اس میں سے الفاظ اور ترکیبات قابل توجہ ہیں جو کہ سبک کے اعتبار سے اپنے پہلے کے ادب سے یعنی انقلاب سے قبل کے ادب سے مختلف ہے الفاظ مثل مستضعفان، مستکبران، شہید، شہادت، لیبی، حبشہ، فجر، اللہ اکبر، عاشورا، قدس وغیرہ کے انقلاب کے اشعار میں زیادہ نظر آتے ہیں۔ یا ایسی نئی ترکیبیں جو نثر میں شامل ہو گئی ہیں بہت زیادہ ہیں یہاں صرف آیت اللہ امام خمینیؑ کے کلام کو سند کے طور پر پیش کیا جائے گا ترکیبیں جیسے: کبوتران حرم اسلام، درخت جہنمی، استعمار، کیننگاہ، محرابی ساجد، نعت خواران استعمار اثر، غرقہ، خاکی، فضائی آماد، جوار معشوق، ستارہ نحس، مستکبران، کوثر عاشورا، زمزم حدایت، مرفہیں بی درد، زمیتون نور و اگبار مدگ وغیرہ۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ جہاں ادبیات انقلاب میں مثبت ترقی ہوئی ہے وہیں کمزوری اور سستی خصوصاً صوری اور زبانی لحاظ سے موجود ہے۔ جو شاید زیادہ تر نا تجربہ کاری اور مطالعہ کی کمی اور جلد بازی کی وجہ سے ہے اور یہ سب ایک فطری چیز ہے۔ کیونکہ ابھی انقلاب کی عمر زیادہ نہیں ہوئی ہے۔ البتہ ان آخری چند سالوں میں نشر میں پختگی اور طرز

بیان میں خوبی پیدا ہوئی۔
 یہاں پر ان کمزوریوں کا دو حصوں میں نظم و نثر کا علاحدہ علاحدہ ذکر کرونگا۔

الف۔ شعر

- ۱۔ بعد از انقلاب کے شاعروں کی جلد بازی
- ۲۔ بعض اشعار میں مضامین کی تکرار
- ۳۔ تصوف و عرفان کی اصطلاحوں اور مطالب کو بیان کرنے کا رجحان اور اس کا اعادہ
- ۴۔ بعض شاعروں کا شعر کے فنی قواعد و قوانین سے ناواقفیت
- ۵۔ درجہ دوم و سوم کے شاعروں کی تقلید نہ کرنا جو مشہور ہیں۔
- ۶۔ بعض شاعروں کی نظموں میں تازہ اور نیا بیان نہیں پایا جاتا
- ۷۔ بعض نظموں میں غیر معمولی الفاظ کا بہت زیادہ استعمال

ب۔ نثر

- ۱۔ داستان کو طوالت سے بیان کرنا۔
- ۲۔ بعض مضامین میں قواعد و آئین زبان کی رعایت نہ رکھنا
- ۳۔ لکھنے والے کا لغت اور تعبیروں سے کم واقفیت ہونا
- ۴۔ مناسب الفاظ کا استعمال مترادفات الفاظ میں نہیں کرنا
- ۵۔ ان الفاظ اور کلموں کے مترادف الفاظ و کلموں کا استعمال کرنا جن کی کچھ ضرورت ہی نہیں۔

- ۶۔ دنیا کے تغیرات و تبدیلیوں سے بے خبری اور بے توجہی
- ۷۔ محاورہ، عوام کی زبان اور متروک الفاظ کا زیادہ استعمال جس سے نثر میں کمزوری اور بد صورتی پیدا ہو جائے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے یہ سب کمزوریاں تمام تصانیف میں نہیں پائی جاتیں اور دور انقلاب کے لکھنے والوں میں بھی پختہ کار نثر نگار اور بہت ہی اچھے لکھنے والے

اسی طرح ضروری ہے کہ ادبیات زمانہ تحفظ اور ادبیات جنگ کی طرف ذرا سا اشارہ کرتا چلوں۔ ان میں سے زیادہ تر الفاظ اور مطالب جو نظم و نثر میں ہمیں ملتے ہیں وہ زیادہ تر ان موضوعات پر ہیں جیسے مدافعت حق پرست بریاطل پرستان اور ایسے لوگوں کا تحفظ جو ہماری سر زمین اسلامی پر دشمنوں کے مقابل اپنے سر اٹھیلی پر لئے کھڑے تھے۔

ادبیات مقاومت و تحفظ کا موضوع اگرچہ کہ قدیم آثار سے تعلق رکھتا ہے اور گزشتہ صدی کی نظم و نثر کا نمونہ ہیں اور ان کا نشان اور وضع شاہنامہ فردوسی کی ہے۔ جیسے داستان کاوہ آہنگرو و ضحاک، یا فرقہ شعوبیہ و سریداروں کی بنی امیہ و تیمور سے جنگ اور وہ مظلوم جنگ نامے جو پرتگالیوں کے حملہ کے وقت جزائر جنوب میں جنوب کے عوام کا دلیرانہ دفاع اور اسی طرح کی چیزوں کا ہم اس میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ لیکن ادب کا عروج اور وسعت و پائنداری کو دیکھا جائے تو اس کا آغاز فتح علی شاہ کے دور سے ہوا اور روس و ایران کی جنگ کے زمانہ سے دور مشروطیت کا آغاز ہوا و مشروطیت کے بعد انقلاب اسلامی اور اس کے بعد آٹھ سال دفاع مقدس و لڑائیوں میں جان دینے والے، اشیاء کرنے والے اور جنگ تحمیلی میں حصہ لینے والے تھے۔ اگرچہ کہ ادبیات مقاومت جنگ و نبرد اور ادبیات جنگ سے بہت مشابہت اور ارتباط رکھتے ہیں۔ اسی طرح ان میں بنیادی فرق یہ دو دیکھے جاسکتے ہیں۔ مقاومت کے ادب میں حاکموں اور ان کے تسلط کے خلاف داخلی اور خارجی چیزوں کا بیان ایک اہم شرط ہے جو ادب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور ان ملکوں کی تہذیب کو بتلاتا ہے جو تسلط اور حکمرانی رکھتے تھے۔ دوسری چیز ادب کا عوام سے نزدیک ہونا اور عوامی زبان کا استعمال ہے۔ اگرچہ کہ بہت سے عام لوگ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہوں نے اس بات میں پہل کی اور اس کو ایجاد کیا۔ اس طرح گزشتہ ادبیات کی تاریخ میں عوام کی خاطر نہیں لکھا گیا جو ادب مقاومت میں ہم کم دیکھتے ہیں۔ صرف روایات سے بغاوت اور آدمیوں میں حرکت اور بیداری کا پیدا ہونا ہے جو ظلم اور نا انصافی کی وجہ سے ظاہر ہو۔ جنگ کے وقت ہم اس ادبیات مقاومت

ادبیات جنگ کے تمدن کا ایک حصہ سمجھیں گے۔ اس طرح لڑنے والے، داستانیں، تحقیق، رپورٹیں، وصیت نامہ وغیرہ ادبیات مقاومت کا ایک عظیم سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔

ادبیات جنگ بیانِ رزمیہ، ہنگامہ، شور و غوغا، شعر و سرود یہ سب جان و مال کی قربانی کے ترجمان، سچائی اور سنجیدگی، محبوبِ حقیقی سے وصل کا شوق، رہبر سے عشق، اور انسان کی معراجِ ملکوتی قید و بند سے رہائی جہنوں نے اپنے تمام عزیزوں سے الگ رہ کر ملک کی مدافعت کے لئے نبرد آزمائی کی اور خلوص کے ساتھ جنگ کی۔ زیادہ تر شہید ہوئے۔ کچھ لوگ جنت کو سدھارے۔ آج ہمیں ان کی یاد شان و عظمت کے ساتھ آتی ہے جو جنگِ تحمیلی میں لڑ کر ہمیشہ کیلئے زندہ اور سرفراز ہونگے۔

اس جنگِ تحمیلی اور اس کے مختلف مراحل کے نشیب و فراز کی تصویر، بہادروں کا بیان اور دلاوروں کی بہادری اور جنگ کے مختلف مراحل کا بیان۔ شاعروں اور لکھنے والوں کے فن میں مختلف صورتوں سے جلوہ گر ہوئی اور دوسرے ادبیات جنگ کے انقلابی فنکار ایسے ہیں جن کے آگے کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ زبان کھولے۔ یہاں چند شاعران انقلاب کا نمونہ کلام پیش کرتے ہوئے اپنے کلام کو ختم کرونگا۔

در چار راہ شہادت از طاہرہ صفار زادہ

آئینیہ زمان است، این پیر در جہار ان از نصر اللہ مردانی

بخشی از سرودہ "شعری برای جنگ" از قیصر امین پور

ارمغان ایران و ہند

(فارسی کا شعری سفر)

مصنف

ڈاکٹر زبیب حیدر

ریڈر شعبہ فارسی

ویمنس کالج۔ عثمانیہ یونیورسٹی